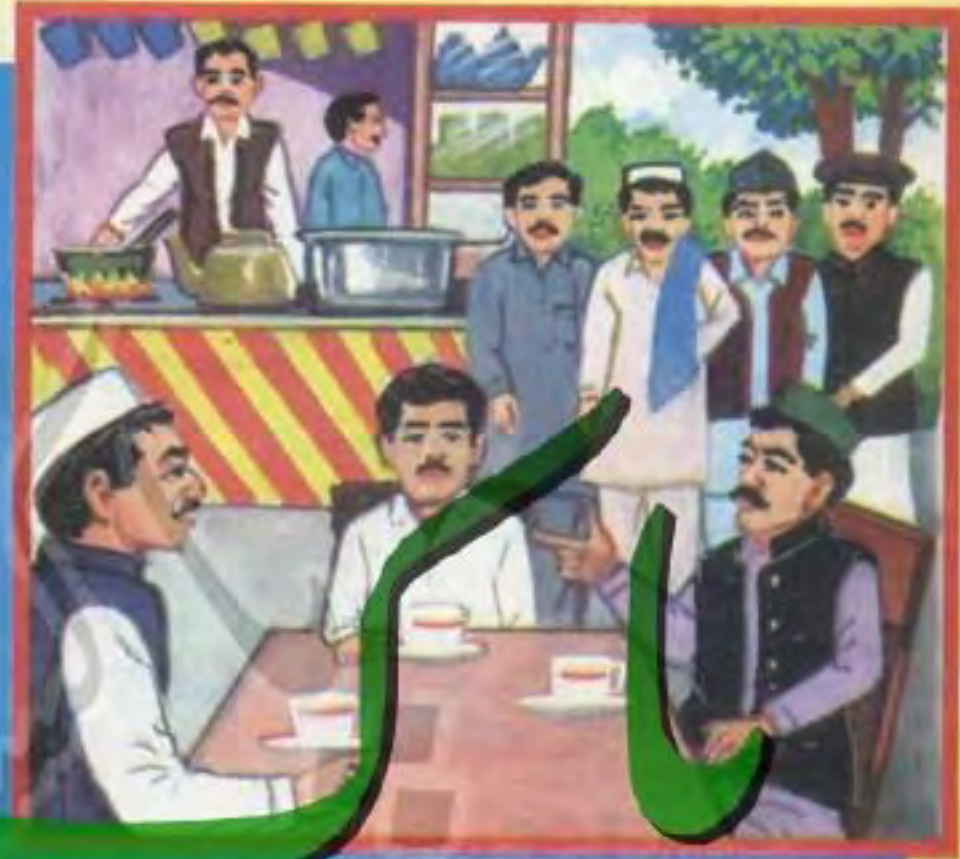




اپریل 2013ء

تعلیم و تربیت



صفحہ نمبر 61

شاہد دراز کے دوست

صفحہ نمبر 40

محاشیہ گرامی



موسم بہار

صفحہ نمبر 60



www.paksociety.com

www.paksociety.com

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

اپریل 2013ء

72 واں سال 12 واں شمارہ رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

اس شمارے میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک بزرگ شبلی نے آرہتی کی دکان سے گندم کی بوری خریدی اور اپنے کاندھے پر لاد کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ بوری کا بوجھ زیادہ اور گھر کا راستہ دور تھا۔ آپ بہت تھک گئے اور شام ہوتے گھر پہنچے۔ بوری زمین پر رکھی، اسے کھولا تو دیکھا کہ ایک چیونٹی گندم کے دانوں کے درمیان ادھر سے ادھر بڑی بے چینی سے بھاگ رہی ہے۔ وہ رات شبلی پر بڑی بھاری تھی۔ آپ تمام رات سو نہ سکے اور بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتے رہے اور سوچتے تھے کہ ننھی چیونٹی اپنے ٹھکانے سے دور ہو گئی ہے، اب کتنی پریشان ہوگی۔ صبح ہوئی تو آپ نے چیونٹی کو وہیں لے جا کر چھوڑا، جہاں سے گندم کی بوری اٹھائی تھی۔

پیارے بچو! چیونٹی ننھا، کمزور سا کیڑا ہے لیکن آخر جان رکھتا ہے۔ بزرگ کا مطمح نظر یہ تھا کہ کسی کو تکلیف نہیں دینی چاہیے، کسی کا دل نہ دکھائیں اور ہمیشہ دوسروں کو خوش رکھیں۔ ہمیں اپنے آپ کو پرکھتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ ہم اس کسوٹی پر کس حد تک پورا اترتے ہیں، تاکہ اچھائیاں سمیٹ کر فلاح و راحت پائیں۔

ساتھیو! تعلیم و تربیت بچوں کا مقبول ترین رسالہ ہے جس کی ترسیل ملک کے تمام حصوں اور بیرون ملک ہوتی ہے۔ کچھ ساتھیو کو شکایت تھی کہ بعض علاقوں میں انہیں اپنا محبوب رسالہ دیر سے ملتا ہے۔ ان دوستوں کی اس شکایت کا ازالہ کرتے ہوئے ہم نے حتی الامکان جلد از جلد ترسیل کی کوشش کی ہے۔ ہمیں آگاہ کیجیے گا کہ ہم اپنی اس کاوش میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔

آپ کی تعلیم و تربیت کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ اور ہم آپ کے دل و جان سے ممنون ہیں۔ ہم تعلیم و تربیت کے معیار کو بہتر سے بہتر کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ!

1	مدیر	اداریہ
2	افضل عاجز	تجدید و نوعت
3	محمد طیب الیاس	درس قرآن و حدیث
4	علی اکمل تصور	زہر
7	نبیاء الحسن نبیاء	ہمارا قومی شاعر
8	نیر رانی شفیق	ٹھٹھے میاں کٹے میاں
11	راشد علی ثواب شاہی	پیارے اللہ کے
13		بوجھ تو جانیں
14		جوانوں کو میری آہ
16	رانا محمد شاہد	سیاحین
18		کھیل دس منٹ کا
19	محمد یونس حسرت	جہنوں کا بادشاہ
24	نفسے قارئین	مطلوبات عامہ
25		صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
27	خوش مزاج قارئین	آپ کے مسکرائیں
28	نہ عزم قارئین	میری زندگی کے مقاصد
29	ڈاکٹر طارق ریاض	بچوں کا انسائیکلو پیڈیا
31	ادارہ	سوال یہ ہے کہ...
32	نفسے کھوئی	آپ کے کھون لگائیے
33	محمد زبیر ارشد	قلم
36	ادارہ	آپ کے عہد کریں
37	زبیدہ سلطانہ	شرپ اٹل کہانی
38		دماغ لڑاؤ
39		اوجھل خاکے
40	محمد فہیم عالم	چھائیو کام نے سرکس
45	نظر زیدی	غریبوں کا آقا
47	ہونہار ادیب	آپ بھی لکھیے
51	ناقد رحیم الدین	انعام
54	ادارہ	سرگرمیاں
55	نفسے قارئین	آپ کا خط ملا
57	وقار حسن	شریے بند
60	کرامت بخاری	موسم بہار
61	احمد عدنان طارق	شاہد اور اس کے دوست
64	ادارہ	بلاتنوان

سرورق: موسم بہار

چیف ایڈیٹر ایڈیٹر، پبلشر اسٹنٹ ایڈیٹر مشیر سرکولیشن اسٹنٹ

عبد السلام ظہیر سلام عابدہ اصغر سعید لخت محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 - ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816

E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت

میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32 - ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔ ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔ امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ:
25 روپے

WWW.PAKSOCIETY.COM

افضال عاجز

نعت رسول مقبول

ساری دُنیا کو جگایا آپؐ نے
راستہ سیدھا دکھایا آپؐ نے
چھٹ گئیں سب کفر کی تاریکیاں
اک دیا ایسا جلایا آپؐ نے
چادرِ رحمت کا سایہ ڈال کر
اپنی اُمت کو بچایا آپؐ نے
ہر طرف اسلام کا بالا ہوا
کفر کو ایسا مٹایا آپؐ نے
نور وہ اسلام کا پھیلا دیا
دو جہاں کو جگمگایا آپؐ نے
کر دیے گل نفرتوں کے سب چراغ
شمع اُلفت کو جلایا آپؐ نے
حق کی خاطر لاکھ تکلیفیں سہیں
غم کو سینے سے لگایا آپؐ نے
اور عاجز سے گناہ گاروں کو بھی
اپنے دامن میں چھپایا آپؐ نے

حمد باری تعالیٰ

بیاں کیسے ہو تیری حمد و ثنا
نہیں تجھ سے برتر کوئی دوسرا
زمین آسمانوں کا خالق ہے تُو
کہ دونوں جہانوں کا رازق ہے تُو
ترے دم سے ہے گلستاں میں بہار
تری ہی بدولت گلوں میں نکھار
یہ چمکیلا سورج یہ تارے یہ چاند
ہو تیرا اشارا تو پڑ جائیں ماند
چرندے پرندے یہ انساں تمام
کہ لے لے کے جیتے ہیں سب تیرا نام
میں عاجز گناہ گار بندہ ترا
خدایا میری بخش دے ہر خطا

بالا ہوا: بلند ہوا، اونچا ہوا

جھوٹ... تباہی کا راستہ

محمد طیب الیاس



اسی طرح جب آپ کو اسکول سے دیر ہو جاتی ہے تو آپ اپنے استاد سے کہہ دیتے ہیں کہ راستے میں ٹریفک کا رش تھا یا کوئی اور بہانہ بنا دیتے ہیں تو یہ سب جھوٹ میں شامل ہو جائے گا۔
کبھی موبائل فون پر بات کرتے ہوئے ہم اپنے دوست کو کہہ دیتے ہیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں، شہر سے باہر ہوں، حالاں کہ آپ گھر ہی پر ہیں۔ لہذا یہ بھی جھوٹ میں شمار ہوگا۔
پیارے بچو!

ہمیشہ سچ بولیں اور سچ کی تلقین کریں، کبھی بھی جھوٹ نہ بولیں کیوں کہ جھوٹا انسان اپنا اعتماد کھو دیتا ہے اور سب اس کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
”بلاشبہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور یقیناً آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے اور بلاشبہ جھوٹ نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور یقیناً آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔“ (بخاری شریف، کتاب الادب 6094، مسلم شریف، کتاب البر والصلة والآداب 2607)

معلوم ہوا کہ آپ جیسا رویہ اپناتے ہیں وہ رویہ ہی آپ کی پہچان بن جاتا ہے۔ اگر سچ بولتے ہیں تو ”سچے“ پہچانے جاتے ہیں اور اگر جھوٹ بولتے ہیں تو ”جھوٹے“ پہچانے جاتے ہیں۔
پیارے بچو!

اچھی باتیں کریں اچھی باتیں پھیلائیں اور اچھے بچے بن جائیں تاکہ سب لوگوں میں آپ کا چرچا اچھا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اچھا مقام اور مرتبہ مل جائے۔

کسی واقعہ کی حقائق سے ہٹ کر بات کہنے کو ”جھوٹ“ کہتے ہیں۔ آئیے! اس بات کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں:
آپ کے پاس بوتل میں پانی ہو۔ کوئی آپ سے کہے کہ بوتل کا تھوڑا سا پانی دے دو۔ آپ اس سے کہیں کہ میرے پاس تو پانی نہیں ہے۔ اب دیکھیے! آپ کے پاس بوتل میں پانی تھا لیکن آپ نے کہا کہ میرے پاس پانی نہیں ہے تو یہ آپ نے ”جھوٹ“ بولا۔
اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہم صرف اپنے عارضی نفع کی خاطر اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں میں بر ملا جھوٹ بول جاتے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ ہم ایک بہت بڑا گناہ کر بیٹھے ہیں۔ اتنا بڑا گناہ جس سے ہمارا خالق اور مالک ہم سے ناراض ہو جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:
”جھوٹ بولنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔“
(سورۃ النور۔ آیت: 7)
لعنت کا مطلب ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری۔ لہذا جو جھوٹ بولتا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔
اس لیے ایک چھوٹے سے نفع کی خاطر اپنے رب کو ناراض کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔

اسی طرح آپ کے گھر پر دستک ہوتی ہے۔ آپ دروازے پر جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں، کون؟ جواب ملتا ہے۔ ”بیٹا! آپ کے ابو جان گھر پر ہوں تو ان کو بلا دیں؟“ آپ ابو جان سے کہتے ہیں کہ فلاں انکل آپ کو بلا رہے ہیں۔ ابو ملنا نہیں چاہتے۔ آپ سے کہتے ہیں کہہ دو کہ ابو گھر پر نہیں ہیں، آفس گئے ہیں یا فلاں کام پر گئے ہیں، حالاں کہ آپ کے ابو تو گھر پر ہی تھے لیکن صرف نہ ملنے کی خاطر آپ کو جھوٹ جیسی بُری عادت میں مبتلا کر دیا۔



علی اکمل تصور

”دادا ابو..... آپ چلے جائیں گے نا.....؟“ حسن نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔ وہ کھل کر بات کہنے کے قابل نہیں تھا۔

”میں چلا جاؤں گا..... کہاں چلا جاؤں گا۔ ابھی تو مجھے تمہاری شادی میں شریک ہونا ہے۔ ابھی تو بہت سے ادھورے کام ہیں جو ہمیں مکمل کرنے ہیں، ویسے بھی مجھے کیا ہوا ہے۔ ٹھیک تو ہوں..... یہ دیکھو.....“ انہوں نے منہ میں ہوا بھر کر اپنے رخساروں کو پھلانے کی کوشش کی اور پھر اپنے بازو سر تک لے جانے کی کوشش میں ناکام ہو گئے۔ حسن کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔ اُسے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب دادا ابو صحت مند تھے۔ جب کبھی حسن اُن سے پوچھتا تھا کہ دادا ابو آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے تو دادا ابو اپنے منہ میں ہوا بھر کر اپنے چہرے کو غبارے جیسا کر لیتے تھے اور پھر پہلوانوں کے انداز میں اپنا بازو سر کی طرف اٹھائے ہوئے حسن سے پوچھتے تھے۔

”مجھے کیا ہوا ہے..... ٹھیک تو ہوں.....“ حسن دانت نکال کر ہنسنے لگتا تھا۔ دادا ابو کی یہ حرکت حسن کو اتنا مزادیتی تھی کہ وہ دن میں دو ایک بار تو دادا جی سے اُن کی طبیعت کے متعلق پوچھ ہی لیتا تھا۔

”مجھے کیا ہوا ہے۔“ اور اب دادا ابو کو کچھ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں

ابا جی اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ احمد علی کے ہاتھ میں زندگی بچانے والی دوا تھی اور ابا جی تھے کہ منہ کھولنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اب محسن کرتا بھی تو کیا کرتا۔ زبردستی وہ کر نہیں سکتا تھا۔ منت سماجت کی، وہ بھی بے اثر ہو رہی تھی۔

”ابا جی..... زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن دوا کھانے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے.....“ احمد علی کا لہجہ رو دینے والا تھا۔ اس وقت وہ سب انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں موجود تھے۔ پچھلی رات ابا جی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ تیسری بار ایسا ہوا تھا اور اب جان بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ ایسے میں ابا جی کی ہٹ دھرمی کہ وہ دوا نہیں کھائیں گے، احمد علی اور اُس کے گھر والوں کی جان نکل رہی تھی۔ کسی حد تک احمد علی خود کو ابا جی کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ اس لیے وہ بے چین تھا لیکن سب سے بُرا حال تو حسن کا تھا۔ آنسو تھے کہ اُس کی آنکھوں سے خشک ہی نہیں ہوتے تھے۔ جب سے دادا ابو کو ہوش آیا تھا، وہ اُن کے قدموں سے لپٹا روئے جا رہا تھا۔

”میرے بچے کیا ہوا ہے.....؟“ انہوں نے نقاہت بھری آواز میں حسن سے پوچھا۔

نے انہیں رات میں ہی ابتدائی طبی امداد دے دی تھی اور اب دادا ابو دوا لینے سے انکار کر رہے تھے۔ احمد علی کے ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ میں دوا تھی۔

”ابا جی..... زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن دوا کھانے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے.....“ ابا جی نے ایک گہری نظر احمد علی کے چہرے پر ڈالی اور پھر اٹکتے ہوئے بولے۔

”درست کہتے ہو بیٹا..... زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دوا کھانے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے لیکن زہر پینے سے تکلیف بڑھ بھی تو جاتی ہے.....“ دادا ابو کی آواز میں بہت درد تھا۔ احمد علی تڑپ کر رہ گیا۔ قریب تھا کہ گلاس اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ ابا جی نے کہاں کی بات کہاں لا کر اُس سے ایک لطیف سا انتقام لیا تھا۔ دوسری طرف حسن روتے روتے ہنس پڑا۔ پھر وہ ایسا ہنسا، ایسا ہنسا کہ سب کو سانپ سوگھ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دادا ابو اس انداز میں اُس کی حمایت کریں گے۔ ابھی کل سہ پہر کی تو بات تھی۔ حسن کے گھر مہمان آنے والے تھے۔ مرکزی مہمان محکمے کا انچارج تھا جہاں احمد علی کام کرتا تھا۔ احمد علی کی ترقی ہوئی تھی۔ اس خوشی میں اس نے اپنے دفتر کے چند دوستوں اور اپنے افسر کی دعوت کی تھی۔ صبح سے گھر میں افراتفری کا سا ماحول تھا۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے تھی۔ اس سلسلے میں چند کھانے امی نے تیار کیے تھے۔ روسٹ مچھلی بازار سے آئی تھی۔ حسن بھی خیال ہی خیال میں کھانے کے مزے لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مہمانوں کے ساتھ ساتھ گھر والوں کی دعوت بھی ہو جائے گی۔ پھر مہمان آ گئے، خوش گپیوں کا دور شروع ہوا۔ اب کھانے کی باری تھی۔ حسن اپنے ذمے لگنے والا ہر کام پوری مستعدی اور تیز رفتاری سے سرانجام دے رہا تھا۔ امی اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ گھریلو کام کاج کے ساتھ ساتھ وہ باورچی خانے میں اپنی امی کی مدد یوں کر رہا تھا جیسے وہ اُن کا بیٹا نہ ہو، بیٹی ہو۔ اس وقت وہ سلاڈ کاٹ رہا تھا جب احمد علی کی بلند آواز سب کے کانوں سے ٹکرائی۔

”حسن بیٹا..... ادھر آؤ.....“ ابو جی مہمانوں کے کمرے میں اُسے بلا رہے تھے۔

”جی آیا.....“ حسن نے چھری کھیرے کے ساتھ ہی لگی رہنے دی اور دوڑ لگا دی۔ اُسے گئے ابھی چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ جیسے چپکے سے قیامت آ گئی ہو۔ احمد علی کے چیخنے کی تیز آواز سب کے کانوں سے ٹکرائی۔

”اچھا..... نالائق..... تم میری بات ماننے سے انکار کرتے ہو.....“ گھر کے تمام افراد کمرے کے دروازے پر جمع ہو گئے تھے۔ کمرے میں سناٹا تھا بس احمد علی کے چیخنے کی آواز آرہی تھی۔

اپنی ذات کی حد تک تو میں صبر کر لیتا تھا۔ آج تم نے مہمان کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ کیا یہی تہذیب میں نے تمہیں سکھائی ہے۔ معافی مانگو اور جو کام یہ کہہ رہے ہیں، وہ کرو۔“

”ابو جی، آپ کی ہر بات میرے لیے حکم ہے۔ آپ آدھی رات کو بھی کوئی کام کہیں گے تو وہ میں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے یہ مہمان آپ کے لیے کتنے محترم ہیں۔ میں ان سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیجیے لیکن آپ کا کام میں نہیں کروں گا.....“ احمد علی کی آواز میں اطمینان تھا۔ ایسا اطمینان جو ہر اس انسان کی آواز میں ہوتا ہے جسے یقین ہوتا ہے کہ وہ سچائی کے راستے پر چل رہا ہے۔

”کتنا بدتمیز لڑکا ہے.....“ احمد علی کا مہمان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی خود ساختہ سوچ کے مطابق اُس کی بات نہ مان کر اُسے گھر بلا کر بے عزت کیا گیا تھا۔ جہاں بے عزتی ہو وہاں کھانا کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محکمے کا انچارج اٹھا تو دوستوں کے تو رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غصے کی شدت سے اُس کا رنگ لال ہو رہا تھا۔

حسن مجرموں کی مانند صحن میں کھڑا تھا۔ گھر کے تمام افراد پریشان تھے۔ وہ سب سمجھ سکتے تھے کہ انچارج کا یوں ناراض ہونا انہیں کتنا مہنگا پڑ سکتا تھا۔ احمد علی جانے کیا کیا کہتا رہا۔ صرف ایک بات پر حسن بول پڑا۔

”آپ کے باس کیا سوچتے ہیں، مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کیا سوچتے ہیں، مجھے اس بات سے فرق پڑتا ہے۔ آپ میرے ابو ہیں، مجھے آپ سے بہت پیار ہے۔ آپ کا ہر حکم مانوں گا لیکن یہ بات نہیں مانوں گا.....“

”بیٹا احمد علی کبھی کبھی ہم خود سے پیار کرنے والوں کے جذبات سمجھ نہیں پاتے۔ شاید آج تم سمجھ پاؤ۔ میری زندگی کی سلامتی کے لیے تم مجھے دوا کھلانا چاہتے ہو۔ تمہارے پیار میں کتنی سچائی ہے، تمہاری تڑپ میں کتنا خلوص ہے، میرے لیے تمہارا جو پیار ہے تمہارے لیے تمہارے بیٹے کا ہے۔ تم کیوں اُس کے پیار کو نہیں سمجھتے۔ وہ بھی تو تمہاری زندگی چاہتا ہے۔ تمہاری سلامتی چاہتا ہے۔“ دادا ابو نے اٹکتے اٹکتے اپنی بات مکمل کی۔ اب احمد علی کے پاس کہنے کے لیے کچھ



نہیں بچا تھا۔ اُس نے ایک نظر حسن پر ڈالی۔ اس ایک لمحے میں اُسے اپنے بیٹے پر بہت ترس آیا۔ وہ کتنا مظلوم تھا اور وہ خود کتنا بڑا ظالم تھا۔ اب احمد علی کو وہ کرنا تھا جو آج تک اس سے کوئی نہیں کروا پایا تھا۔ گھر کے تمام افراد نے اپنی اپنی کوشش کر لی تھی لیکن کسی کو کام یابی نہیں ملی تھی۔ آج کام یابی حسن کا مقدر تھی۔ احمد علی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جب اُس کا ہاتھ باہر نکلا تو سب نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں سگریٹ کی ایک ڈبیا تھی۔ احمد علی ایک عادی سگریٹ نوش تھا۔ ہمیشہ اُس کی جیب میں ایک بھری ہوئی ڈبیا رہتی تھی۔ اب یہ ڈبیا اُس کے ہاتھ میں تھی۔

”آپ زندگی بچانے والی دوا لیجیے۔ میں زندگی لینے والا زہر چھوڑتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر احمد علی نے ڈبیا اپنی مٹھی میں بھینچ دی۔ یوں جیسے وہ ڈبیا کی جان لے رہا ہو۔ گھر کے تمام افراد کے چہروں پر مسکراہٹیں کھل اٹھیں تھیں۔

”اب دوا لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ میری تکلیف تو ویسے ہی کم ہو گئی۔“ دادا ابو کا سوتا ہوا چہرہ اب ہشاش بشاش نظر آنے لگا تھا اور احمد علی۔۔۔۔۔ اُسے اب یقین ہو گیا تھا کہ ابو اور دادا ابو کہیں نہیں جائیں گے۔ اُس کے سر پر اُن دونوں کا سایہ ہمیشہ سلامت رہے گا۔

”خاموش۔۔۔۔۔ میرے سامنے زبان کھولتا ہے۔“ ابو نے غصے میں ایک تھپڑ حسن کے رخسار پر جڑ دیا۔ حسن سک سک کر رونے لگا۔ درد سے زیادہ دکھ کی تکلیف اُسے رُلا رہی تھی۔ ابو اُس کی بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ ایسے میں دادا ابو نے حسن کو سہارا دیا۔ وہ اُن کی آغوش میں جیسے چھپ گیا ہو۔

”میرے بچے، تم اتنے اچھے ہو۔ جب ابو کی ہر بات مانتے ہو تو یہ بات ماننے میں کیا حرج ہے۔“ دادا ابو پیار سے بولے۔

”مجھے ابو سے بہت پیار ہے۔ ہمیں اُن کی بہت ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زندہ رہیں۔۔۔۔۔ ہمیشہ زندہ رہیں۔ اب میں انہیں اپنے ہاتھ سے زہر کیسے لا دوں۔ میں یہ بات نہیں مانوں گا۔ اپنے لیے انہوں نے اگر زہر خریدنا ہے تو خود خریدیں میں تو نہیں خریدوں گا۔ میں تو نہیں مانوں گا۔۔۔۔۔ میں کبھی نہیں مانوں گا۔“ اور اب دادا ابو نے اپنے بیٹے سے اپنے پوتے کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا لطیف سا انتقام لیا تھا۔

”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دوا کھانے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے لیکن زہر پینے سے تکلیف بڑھ بھی تو جاتی ہے۔“ اور اب حسن ہنس رہا تھا۔

ہمارا قومی شاعر

یاد آیا ہے شاعرِ مشرق
جو کہ پیارے نبیؐ کا تھا عاشق
بالِ جبریل ہو کہ بانگِ درا
اس کے اشعار سچے دل کی صدا
اس حقیقت سے ہے کسے انکار
اس نے ہی قوم کو کیا بیدار
اس کے شعروں میں موجزن ہے حیات
اس نے سمجھائے زندگی کے نکات
اس نے درسِ خودی دیا ہم کو
اس کے افکار دوستو سمجھو
اس کا پیغام یاد رکھیں گے
ہم بلندی کی سمت دیکھیں گے
وہ مدبر تھا وہ مفکر تھا
اپنا اقبال قومی شاعر تھا



ضیاء الحسن ضیا



میٹھے میاں اور کھٹے میاں کی چھٹیاں

کس طرح گزاریں گے۔ بس یہی بات سوچ کر وہ اپنی امی کے پاس گئے اور بولے۔ ”پیاری امی! نئی جماعت کا آغاز تو اسکول کھلنے پر ستمبر میں ہو گا، کہیں بغیر پڑھے ہم نکلے نہ ہو جائیں۔“ پیاری خاتون اپنے ہونہار بیٹے کی بات سن کر محبت سے بولیں۔ ”بیٹا! واقعی تین ماہ کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ نئی جماعت کا کورس خرید لیجیے۔ ہم گھر پر استاد صاحب کا انتظام کر دیں گے۔ بس آپ اپنے بھائی کھٹے میاں کو بھی بلا لیجیے۔“ پیاری خاتون نے اسی وقت اپنے شوہر اچھے میاں سے بات کی تو انہوں نے اسی دن دونوں بیٹوں کو نئی جماعت کی کتابیں اور کاپیاں خرید کر دے دیں اور اگلے روز سے استاد صاحب بھی گھر آ کر انہیں پڑھانے لگے۔

اچھے میاں اپنے بیٹے کی عقل مندی پر بہت خوش تھے کہ اس کی اچھی صلاح کی بنا پر دونوں بچوں کا وقت ضائع ہونے سے بچ گیا۔ اس طرح جب وہ نئی جماعت میں جائیں گے تو انہیں بہت کچھ آتا ہو گا۔

”میٹھے میاں! آؤ ذرا چھت پر چلیں، پتنگ اڑائیں گے۔“ کھٹے میاں نے اپنے بھائی کے کان میں چپکے سے کہا مگر میٹھے

پیارے بچو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ شاداب نگر میں اچھے میاں اور پیاری خاتون اپنے دو جڑواں بچوں میٹھے میاں اور کھٹے میاں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے یہ جڑواں بیٹے ان کے گھر کی رونق تھے۔ ان کی معصوم باتوں، قہقہوں، شرارتوں اور نوک جھونک سے گھر کی فضا پر بہار رہتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کھٹے میاں کی شرارتیں اور حرکتیں اس نوعیت کی ہو جاتی تھیں جس پر انہیں سزا بھی ملتی تھی لیکن وہ جلد ہی توبہ کر کے اچھا بچہ بن جاتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حکومت نے تعلیمی پالیسی میں کچھ تبدیلی کی اور امتحانات مارچ کے بجائے مئی کے اختتام پر ہوئے اور نتائج کے اعلانات کے ساتھ ہی موسم گرما کی تعطیلات ہو جاتیں۔

اس مرتبہ جب موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو کھٹے میاں خوشی سے پھولے نہ سمائے کیوں کہ حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کے سبب سالانہ امتحان کے بعد نتائج کا اعلان تو ہو گیا اور اگلی جماعت میں بھی اچھے نمبروں سے ترقی پا گئے تھے مگر چوں کہ نئی کلاسز کا آغاز نہیں ہوا تھا، لہذا ہوم ورک بھی نہیں ملا تھا اور عیش کرنے کے لیے پورے تین ماہ تھے۔ میٹھے میاں ہر سال کی طرح امسال (اس سال) بھی اول آئے تھے اور پریشان تھے کہ تین ماہ کا عرصہ بغیر پڑھے

نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں بھائی! اس وقت شدید گرمی ہے اور امی بھی ناراض ہوں گی اور پچھلا واقعہ کیا بھول گئے، دوپہر اور گرما بھوت والا۔“

یہ سن کر کھٹے میاں جھنجھلا گئے اور بولے۔ ”وہ پرانی بات ہے، اسے چھوڑو۔ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔“

”مگر کھٹے بھائی! بات تو وقت ضائع کرنے اور نافرمانی کی ہے۔“

میٹھے نے حسب عادت اسے سمجھایا۔ اب کھٹے میاں کو غصہ آ گیا اور بولے۔

”صبح قاری صاحب آجاتے ہیں، پھر قرآن پڑھنے کے بعد یومیہ کام جو استاد صاحب دیتے ہیں، وہ کرنا پڑتا ہے، بازار سے سودا سلف لانا پڑتا ہے اور شام کو استاد صاحب سے پڑھنا پڑتا ہے۔ صرف دوپہر کا وقت ہی بچتا ہے اور پتنگ اسی وقت اڑائی جا سکتی ہے۔“

بھائی کی باتیں سن کر میٹھے میاں مسکرا دیے اور بولے۔

”کھٹے میاں! قرآن پڑھنا اور گھر کے کاموں میں والدین کا ہاتھ بٹانا ہمارا فرض ہے۔ استاد صاحب سے پڑھ کر بھی ہم فائدے میں رہتے ہیں۔ علم کی دولت حاصل کرتے ہیں اور پھر ان سے پڑھنے کے بعد ہم سب دوست گراؤنڈ میں کرکٹ بھی تو کھیلتے ہیں۔ رات کے وقت کمپیوٹر پر گیمز بھی کھیلتے ہیں اور ہاں یاد آیا کارٹون چینل پر من پسند کارٹون بھی دوپہر کے کھانے سے قبل دیکھتے ہیں۔“

ساری تفصیل سن کر کھٹے میاں نے منہ بنا لیا اور بولے۔

”پتنگ تو پھر رہ گئی۔“

میٹھے میاں ہنستے ہوئے بولے۔ ”بھائی! موسم اچھا ہو لینے دو، کسی دن امی کی اجازت سے پتنگ بھی اڑالیں گے۔“

یہ سن کر کھٹے میاں ناراض ہو کر وہاں سے چل دیے۔

میٹھے میاں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کب سدھرو گے کھٹے میاں؟“

”میٹھے میاں! یار چھٹیاں کچھ بور گزر رہی ہیں، پھوپھو جان کے ہاں دوسرے شہر کا پروگرام نہ بنا لیا جائے؟“

اگلے روز کھٹے میاں نے دوستانہ انداز میں میٹھے میاں کو کیاری

میں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف دیکھ کر کہا۔

”نہیں بھئی! ابھی نہیں کیوں کہ ہم نے ابھی نئی تنظیم بنائی ہے جس میں محلے کے سب لڑکوں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے محلے میں صفائی کا انتظام کریں گے۔ گلی محلوں کو صاف رکھنے کی مہم کا آغاز کریں گے۔“

کھٹے میاں چیخ اٹھے۔ ”کیا..... کیا؟ تو جمعدار بن کر گلیوں کی صفائی کرنے کا بھوت ابھی تک تمہارے سر سے نہیں اتر آیا؟“

میٹھے میاں حسب عادت ہنس دیے اور بولے۔

”یہ وطن ہمارا گھر ہے اس کی گلیاں، چوک اور یہ محلے سب کچھ ہمارا ہے۔ جب ہم اپنے گھر کے آگن کو چمکاتے ہیں تو کیا گلی محلوں کو صاف رکھنا ہمارا فرض نہیں ہے۔“

کھٹے میاں نے منہ بنا لیا اور خاموشی سے وہاں سے چل دیے۔ اسی شام میٹھے میاں اور ان کے دوستوں شارق، شاداب، علی منصور، ببلو، نوئی، اسامہ، حیدر اور عثمان نے چوک میں اپنے گھروں سے کرسیاں لا کر رکھ دیں۔ تمام بزرگوں اور نوجوانوں سے درخواست کی کہ وہ آج شام کی میٹنگ میں ضرور شرکت کریں۔

دیکھتے ہی دیکھتے تمام اہل محلہ ان کی بات سننے کے لیے وہاں اکٹھے ہو گئے۔

تلاوت کلام پاک کے بعد تمام لڑکوں نے باری باری صفائی کے عنوان پر تقریر کی جب کہ آخر میں میٹھے میاں نے اپنی تقریر میں کہا: ”اہل محفل! حضور پاکؐ نے فرمایا! صفائی نصف ایمان ہے۔ ہم سب مسلمان ہیں اور اسلام ہمیں پاک صاف رہنے کا درس دیتا ہے۔ ہم اپنے گھر تو صاف کر لیتے ہیں مگر گلی اور محلے گندے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگرچہ ٹی ایم اے کی طرف سے جمعدار آتے ہیں مگر وہ بھی ہماری غفلت کی وجہ سے اپنے فرائض صحیح طرح انجام نہیں دیتے۔ ہم گھروں سے باہر گندگی پھینک دیتے ہیں جس کی وجہ سے موسم برسات میں تعفن (بدبو) اور جراثیم پھیلتے ہیں۔ اس گندگی کے باعث کھیاں اور مچھر بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم اپنی گلی اور محلے کو صاف کریں گے۔ امید ہے کہ آپ سب ہمارا ساتھ دیں گے تاکہ آلودگی سے پاک معاشرے میں صحت مند نسل پروان چڑھ سکے۔“

ستھرے رہنے لگے۔ اس بات کا چرچا ہوا تو صحافیوں نے بھی خبریں لگائیں کہ بیٹھے میاں اور ان کے دوستوں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے علاقے کو صاف کر کے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس کام میں سب کو اتنا مزا آیا کہ ہر کوئی ہنسی خوشی صفائی کمیٹی کا رکن بنتا چلا گیا۔ اس طرح شاداب نگر کا چپہ چپہ صاف ہو کر مزید خوب صورت لگنے لگا۔ یہ دیکھ کر ضلع ناظم اور ضلعی کمشنر نے بیٹھے میاں اور ان کی ٹیم کو انعامات سے نوازا۔ کھٹے میاں پہلے پہل تو ان سرگرمیوں سے نالاں رہے مگر ایک دن صبح سویرے سب کیا دیکھتے ہیں کہ کھٹے میاں اپنے گھر کے سامنے جھاڑو لیے صفائی کر رہے ہیں۔ بیٹھے میاں اپنے بھائی کو صفائی کرتے دیکھ کر گنگنا اٹھے۔



یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے
کھٹے میاں نمناک آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ بولے۔ ”ہاں بیٹھے میاں! مجھے احساس ہو گیا ہے کہ اس ارض پاک کا خیال رکھنا ہم سب پر اسی طرح فرض ہے جس طرح ہم اپنے گھر کا خیال رکھتے ہیں کیوں کہ اپنی گلیوں اور محلوں سے ہماری پہچان ہے۔ اس کی پاسبانی اور نگہبانی ہمارا فرض ہے۔“
بیٹھے میاں نے مسکرا کر کھٹے میاں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ”یار! بہت دن ہو گئے پھوپھو کی طرف نہیں گئے۔“
بیچھے سے ان کے ابو کی آواز آئی۔ ”بیٹا! میں ٹکٹیں لے آیا ہوں۔ ہم کل ہی لاہور جا رہے ہیں۔“
دونوں نے نعرہ مارا۔ ”اچھے ابو، زندہ باد۔“

اچھے میاں نے محبت سے اپنے دونوں بچوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ ☆☆☆

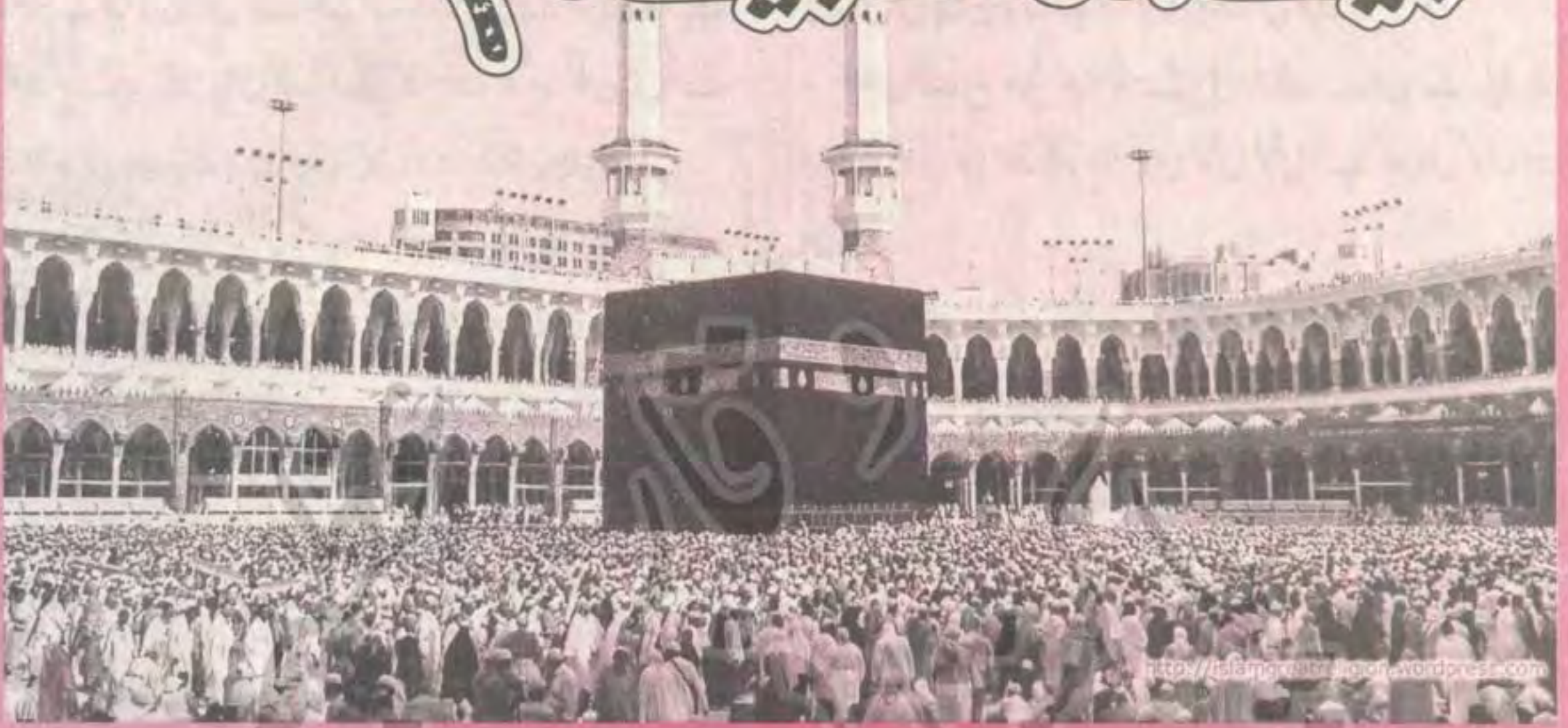
مارچ 2013ء میں ”آپ بھی لکھیے“ کے انعام یافتگان

- 1- ”خزانہ“ لیاقت علی، خانیوال۔ 2- ”حسن اخلاق“ انعم سلیم، راول پنڈی۔ 3- ”ہم زندہ قوم ہیں“ طوبی شوال، عثمان پورہ۔

اس کی مؤثر تقریر سن کر سب نے پرجوش تالیاں بجائیں اور سب سے پہلے محمد موسیٰ صاحب جو کہ گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، انہوں نے کہا: ”ہمارے بچوں میں قوم و ملک کے لیے جو جذبہ ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور کوڑے کا ایک ڈرم خرید کر ان نوجوانوں کی تنظیم کی نذر کرتا ہوں تاکہ صفائی کے بعد گندگی اس ڈرم میں پھینکی جا سکے۔“ اس کے بعد یکے بعد دیگرے تمام نوجوانوں اور بزرگوں نے بیٹھے میاں اور ان کے دوستوں کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے دو لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ صبح سویرے محلے کے جمعدار سے صحیح صفائی کرانے کے لیے جمعدار کو پابند کریں گے۔ اس کے بعد کوڑے کا ڈرم چوک میں نصب کر دیا گیا کہ سب اس میں کوڑا ڈالیں۔ جگہ جگہ کوڑا دان بنا دیے گئے اور ہر کسی کو پابند کر دیا گیا کہ وہ اپنے گھر کے باہر گلی میں صفائی رکھے۔ نیز اگر کوئی اپنے گھر کی گندگی باہر پھینکے گا اور کوڑے دان میں نہیں ڈالے گا تو اس کو جرمانہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ روزانہ دو لڑکے پانی کی بڑی ٹیوب سے ہلکا ہلکا چھڑکاؤ بھی کریں گے۔

بس پھر کیا تھا ہر شخص اپنے گھر کے سامنے خود صفائی کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس محلے کی تمام گلیاں اور چوک صاف

پیارے اللہ کے پیارے نام



الْفَتْاحُ جَلَّ جَلَالُهُ

(سب کے لیے رحمت کے دروازے کھولنے والا)

الْفَتْاحُ جَلَّ جَلَالُهُ وہ ذات ہے جو اپنے بندوں کے لیے اپنی رحمت اور رزق کے دروازوں کو کشادہ کرتا ہے اور ان کے مشکل مسائل کو حل فرماتا ہے۔ اپنے بندوں کے گناہوں کی وجہ سے وہ اپنی نعمت کے دروازوں کو بند نہیں کرتا۔

عزیز ساتھیو! قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”جس رحمت کو اللہ لوگوں کے لیے کھول دے تو کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے اور جسے وہ روک لے تو کوئی نہیں ہے جو اس کے بعد اسے چھڑا سکے اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔“

مشکل ہوئی آسان

برسوں پرانی بات ہے۔ تین آدمی سفر پر جا رہے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ فوراً ان تینوں نے ایک غار میں پناہ لے لی۔ طوفانی بارش کی وجہ سے غار کے منہ پر پہاڑ کی ایک چٹان گر پڑی اور وہ غار جس میں وہ بارش سے حفاظت کے لیے بیٹھے

تھے اس کا دہانہ چٹان گرنے کی وجہ سے بند ہو گیا۔

اب تو تینوں بڑے پریشان ہوئے کہ یہ چٹان تو کسی بھی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی۔ اس غار سے کیسے باہر نکلا جائے.....؟ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ مشورہ کرنے پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ زندگی میں کوئی ایسا کام جو صرف ہم نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا ہے اس نیک عمل کا واسطہ دے کر اس وسیلے کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے ہیں۔ شاید اس برکت سے اللہ تعالیٰ ہمارے لیے راستہ کھول دے۔

ان میں ایک شخص نے کہا: ”اے اللہ! میرے والدین ضعیف تھے۔ میری بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں ان کے لیے روزانہ بکریاں چراتا تھا۔ جب شام ہوتی تو ان بکریوں کا دودھ دوہتا اور سب سے پہلے اپنے بوڑھے والدین کو پلاتا اور پھر اپنی بیوی بچوں کو پلاتا۔“

ایک روز میں لکڑیاں تلاش کرنے کے لیے جنگل میں دُور نکل گیا اور دیر سے واپس آیا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں نے جلدی سے دودھ دوہا، پھر دودھ کو ایک برتن میں ڈالا اور اپنے

نکل سکتے۔

پھر تیسرے شخص نے بھی اپنے نیک عمل کے ذریعے سے دُعا مانگی اور جیسے ہی اس کی دُعا مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے غار کے منہ سے اس کی چٹان کو ہٹا دیا اور پورا راستہ کھل گیا۔

اس الْفَتْاحُ جَلَّ جَلَالُهُ نے اپنی رحمت سے ان کے لیے بند دروازہ کھول دیا اور پھر وہ تینوں خوشی خوشی اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت کیا مانگیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اسے چاہیے پہلے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر یہ دُعا مانگے:

اللَّهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ.

ترجمہ: اے اللہ! میرے لیے آپ اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجیے۔

یاد رکھنے کی باتیں

اس نام مبارک سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہر مشکل اور پریشانی کو راحت میں تبدیل کرنے والے صرف اکیلے اللہ تعالیٰ ہیں۔ جس طرح اس نے ان تینوں آدمیوں کی مدد کی اور ان کے لیے بند دروازے کو کھولا تو ہمیں بھی یقین ہوا کہ ہر مشکل، پریشانی، مصیبت کو وہی حل فرمانے والے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جو ہماری مشکل حل کر سکے۔ ہر قسم کی راحت، رحمت اور آسانی وہی الْفَتْاحُ جَلَّ جَلَالُهُ عطا فرماتے ہیں۔

جب بھی مسجد میں داخل ہوں تو توجہ اور ترجمہ کے دھیان کے ساتھ دُعا مانگیں تاکہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں۔ دُعا یہ ہے:

اللَّهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ.

☆☆☆

والدین کے سر ہانے کھڑا ہو گیا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے والدین کو نیند سے جگاؤں اور مجھے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ والدین سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلاؤں، حالاں کہ بچے بھوک سے میرے قدموں میں بلک بلک کر رو رہے تھے۔ وہ دودھ پینے کی ضد کر رہے تھے یہاں تک کہ صبح کا وقت ہو گیا لیکن میں نے اپنے والدین سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو دودھ نہیں پلایا۔

اے اللہ! اگر میرا یہ عمل آپ کو راضی کرنے کے لیے تھا تو اس عمل کی برکت سے ہمارے واسطے اس غار کا منہ کھول دے اور ہمیں باہر جانے کا راستہ دے دے۔“

جیسے ہی اس نے دُعا مکمل کی تو غار سے تھوڑی سی چٹان ہٹ گئی انہیں آسمان نظر آنے لگا، مگر ابھی راستہ اتنا نہیں کھلا تھا کہ وہ باہر نکل سکیں۔

پھر دوسرے ساتھی نے دُعا مانگی: ”اے اللہ! میں نے ایک مزدور کو ملازمت کے لیے رکھا۔ مزدوری میں اسے چاول دینے تھے۔ جب اس نے مزدوری ختم کر دی تو اس نے کہا کہ میرا حق مجھے دے دو۔ میں نے اس کی مزدوری میں اسے چاول دیے تو وہ ناراض ہو کر انہیں لیے بغیر چلا گیا۔ وہ اپنی مزدوری نہ لے سکا۔“

① میں نے ان چاولوں سے کھیتی باڑی کی اور چاولوں سے اور چاول اُگائے۔ اس میں بہت برکت ہوئی پھر میں نے انہی چاولوں سے گائیں اور مویشی جمع کر لیے۔

پھر کافی عرصہ بعد وہ ایک مرتبہ میرے پاس آیا اور اپنی مزدوری مانگنے لگا۔ میں نے کہا: ”جاؤ وہ ساری گائیں اور مویشی تم لے لو۔“ وہ کہنے لگا: ”اللہ سے ڈرو اور مجھ سے مذاق مت کرو۔“ میں نے کہا: ”میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔“ اور اسے ساری صورت حال بتائی۔

② ”جاؤ ساری گائیں اور جانور لے لو۔“ اس نے وہ سب لے لیں اور چلا گیا۔

”اے اللہ! اگر میں نے یہ کام آپ کو راضی کرنے کے لیے کیا ہے تو ہمارے لیے جو رکاوٹ باقی رہ گئی ہے اس کو دور فرما۔“ چٹان چہ چٹان تھوڑی سی اور سرک گئی، مگر ابھی اتنا راستہ نہ ہوا کہ وہ

بوجھوتو جائیں

گھر گھر میں ہے اس کا کام
بولو کیا ہے اس کا نام؟

آندھی ہو یا تیز ہوا
کبھی بجھے نہ ایک دیا

جس شے کو جھولی میں ڈالے
اوپر نیچے خوب اچھالے

دیتی ہے رہ رہ کر جھٹکے
دے کر جھٹکے، نیچے پٹنے

وہ چھوٹے ہیں یا وہ بڑے ہیں
لیکن سر پر چڑھ کے کھڑے ہیں

سر ہے چپٹا منہ نوکیلا
بگڑے کام سنوارے

جو پکڑے وہ ہاتھ میں لے کر
سر پر چوٹیں مارے

کوئی نہ چھین سکے اک شے
جس کی ہے بس اس کی ہے

ایک استاد ایسا کہلائے
آپ نہ بولے سبق پڑھائے

گوری ہے یا کالی ہے
چھپ کر رہنے والی ہے

جب بھی پکڑی جاتی ہے
اپنی جان گنوا تی ہے

مٹی گار اُن کا کھا جا
دیواروں سے اُن کا سا جھا

رنگ برنگی چھیل چھیلی
سرخ، بستی، اودی، نیلی

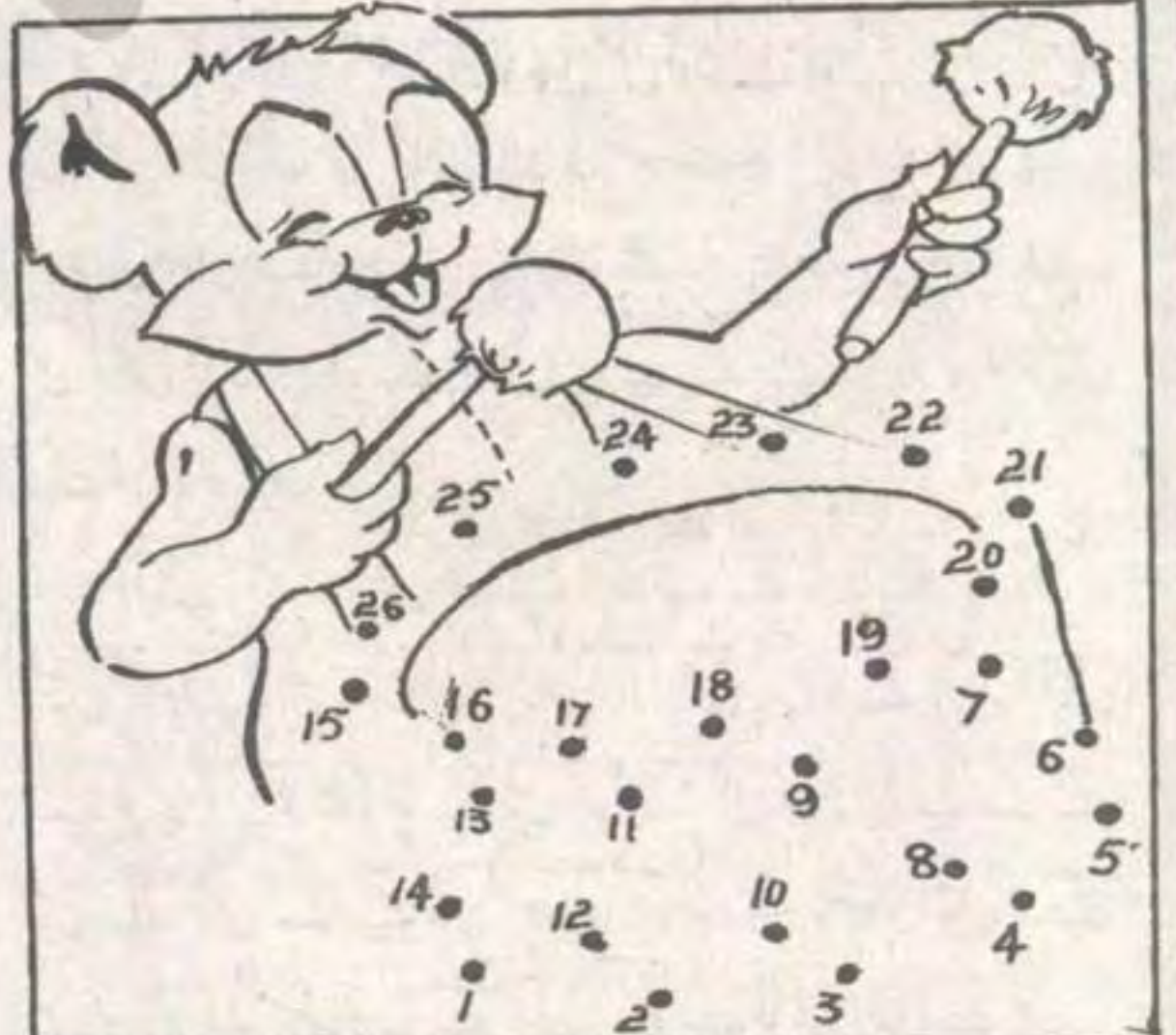
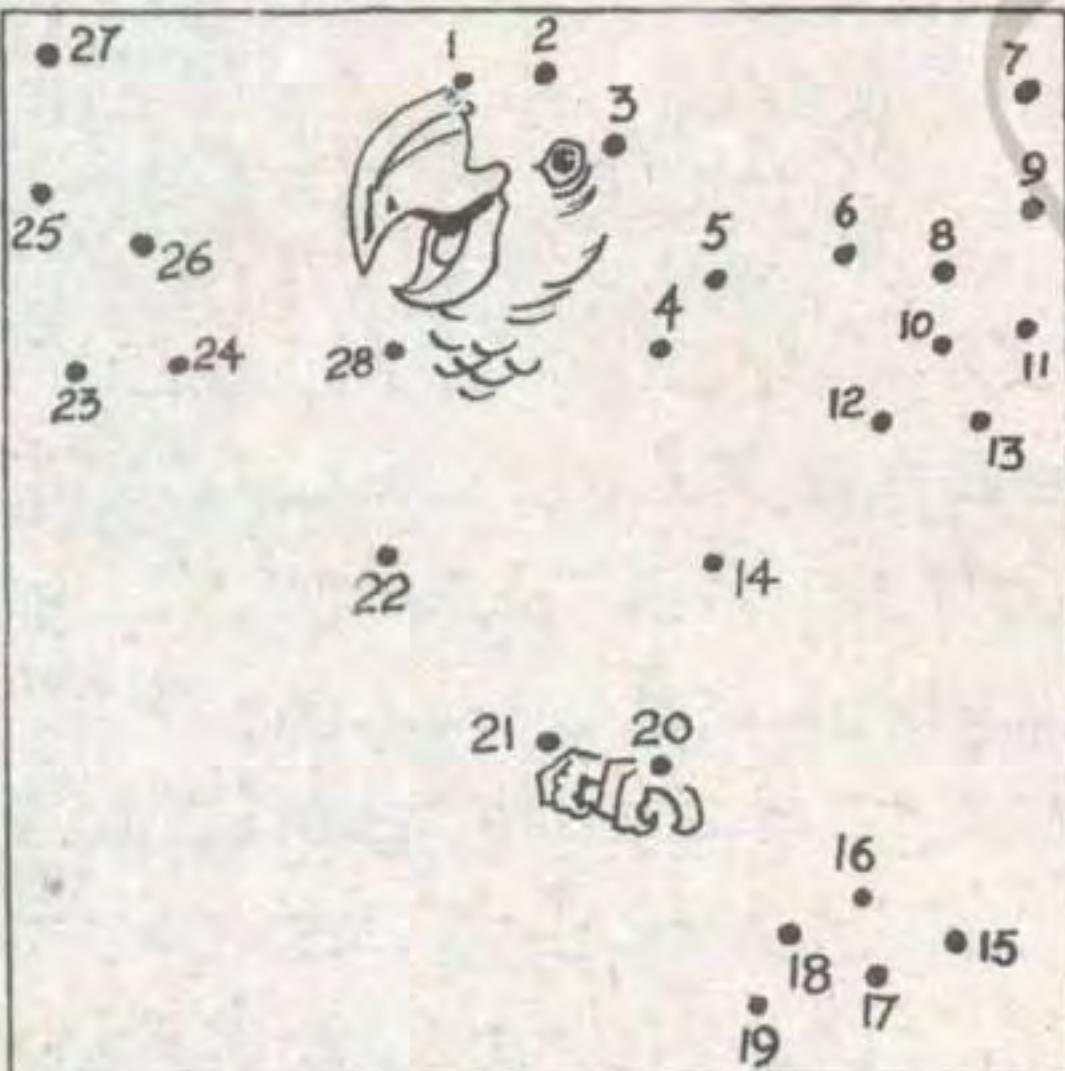
بنا تیر کے ایک کمان
جس کو دیکھے ایک جہان

دھرتی ہی سے رشتہ جوڑے
دھرتی ہی سے سر بھی پھوڑے

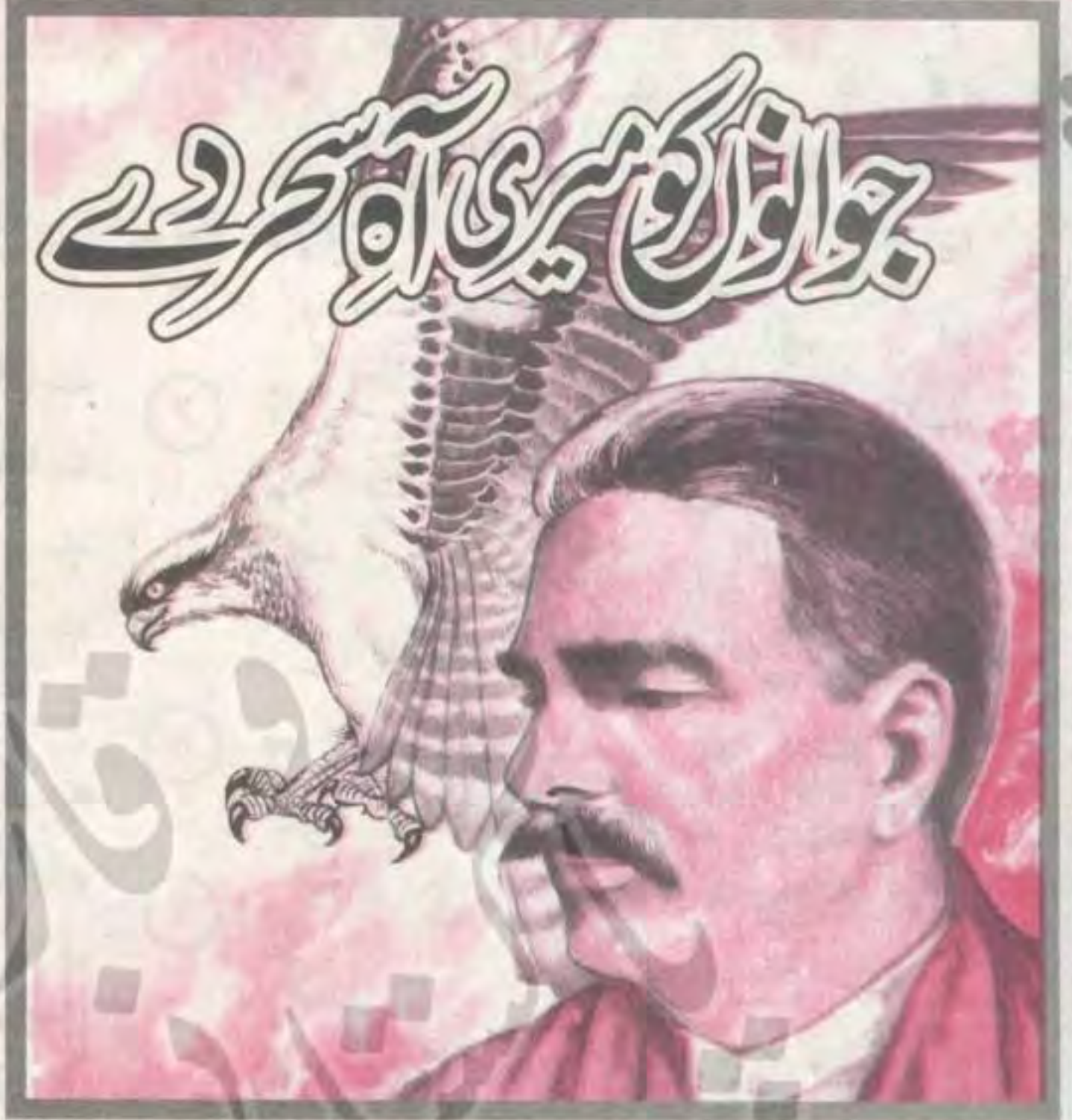
لہو-10، لہر-6، سونہ-8، 2، 7

6، 9، 5، 2، 4، 3، 2، 1، 1: جہان

نقطے ملائیے



جوانوں کی میری آواز ہے



یعنی جب جوانوں میں عقاب کی روح بیدار ہوتی ہے اور جب ان میں ارادے اور ہمت کی بلندی کا خاص جوہر پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی منزل مقصود آسمانوں کو بنا لیتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ ہمیشہ اپنے نوجوانوں کو اُمید کا سبق دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

نہ ہو نومیڈ، نومیڈ زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمید مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
یعنی اے نوجوان اگر حالات موافق نظر نہ آئیں تو نا اُمید نہ ہو کیوں کہ نا اُمیدی علم و عرفان کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ مومن کی یہ شان ہے کہ وہ مایوس نہیں ہوتا۔ اس کی اُمید کا چراغ کبھی نہیں بجھتا۔ مردِ مومن کی اُمید کا شمار خدا کے راز دانوں میں ہوتا ہے۔ اقبالؒ کا نوجوان جفاکش ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے ہیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
اقبالؒ فرماتے ہیں، اے نوجوان تیرا ٹھکانا بادشاہی محل کا گنبد نہیں ہے، تو شاہین ہے۔ ان مخلوق کو خیر باد کہہ دے کیوں کہ یہ محل تجھے تن آسان بنا دیں گے۔

علامہ اقبالؒ جب اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو لندن کے برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اور یورپ کے دیگر شہروں کی لائبریری میں مختلف علوم و فنون پر قدیم مسلمان علماء، حکماء اور فلسفیوں کی لکھی ہوئی بیش بہا کتابیں ان کی نظر سے گزریں، جو اہل یورپ مسلمان ملکوں سے لوٹ کر لے گئے تھے۔ اپنے بزرگوں اور اسلاف کی گراں قدر علمی ورثے کو اہل یورپ کے قبضے میں دیکھ کر انہیں بہت دلی دکھ ہوا۔

اقبالؒ مسلم نوجوان کو اپنے اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر انہیں جھنجھوڑتے ہیں اور ان کا شان دار ماضی یاد دلاتے ہیں۔ اقبالؒ اپنے نوجوانوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ تمہارا علمی ورثہ یورپ کے قبضے میں ہے، جس کے نتیجے میں مسلمان جہالت کی پستیوں میں گر گئے ہیں اور یورپ مسلمانوں کے علمی ورثے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں خالق کائنات سے لے کر مخلوق کائنات تک سبھی سے خطاب کیا ہے۔ وہ بہ طور خاص نوجوانوں کے شاعر ہیں۔ وہ براہِ راست نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ نوجوان ہی اقبال کی اُمیدوں کا مرکز ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو بچوں سے بھی خاص رغبت تھی۔ اقبالؒ کا نوجوان اور شاہین بچے جفاکش، پر اُمید اور سراپا عمل ہیں۔ اقبالؒ اپنے نوجوانوں کو سخت محنت کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ علامہؒ نوجوانوں سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں:

تیرے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلّاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
کہ اے نوجوان! تو نے ایران کے قالین اور افرنگ (انگریزوں) کے صوفے بنوائے ہیں کیا تجھے عیش و آرام کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں۔ تمہاری تن آسانی دیکھ کر میری آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔ اے نوجوان! تجھے سخت جان ہونا چاہیے تاکہ تو بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکے۔ فرماتے ہیں:

عقاب کی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اقبال پہلے تو اپنے نوجوان کو باہمت، جفاکش اور پر اُمید دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر ان کی موجودہ بے حسی کو جھنجھوڑتے ہیں اور فرماتے ہیں:

کبھی اے نوجوان مسلم تدبیر بھی کیا تو نے؟

وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

یعنی اے مسلم نوجوان تو نے کبھی غور کیا کہ تیرے بزرگ عظیم علمی ورثے کے مالک تھے۔

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں

کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے جس نے عظیم ایرانی سلطنت کو روند ڈالا تھا۔ تیرے اسلاف کی عظمت کے نشان آج بھی تاریخ میں ملتے ہیں۔

تمدن آفریں، خلاق آئین جہاں داری

وہ صحرائے عرب، یعنی شتر بانوں کا گہوارا

اے نوجوان وہ قوم عرب کے صحراؤں سے اٹھی تھی جو اونٹ پالتے تھے لیکن انہوں نے دنیا کو ایک نئی تہذیب اور تمدن دیا۔

تجھے اپنے آبا سے نسبت ہو نہیں سکتی

کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

اے نوجوان تو اس قوم کی اولاد ہونے کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن تیری اور اس کی کیا نسبت۔ وہ سراپا عمل تھے۔ وہ سراپا جرکت تھے۔ تو صرف باتیں بناتا ہے۔ تو گفتار کا غازی ہے۔ تو نے اپنے بزرگوں کی میراث گنوا دی اور آسمان نے تجھے ثریا سے زمین کی پستیوں میں پھینک دیا۔

اے نوجوان غم یہ نہیں کہ تیرے ہاتھ سے حکومت نکل گئی غم تو یہ ہے کہ تجھ سے مسلمان قوم کا علمی اور تہذیبی ورثہ چھن گیا۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی

جو دیکھیں یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارا

اے نوجوان یورپ میں علم کے وہ موتی ہیں جو مسلمانوں کے پاس تھے۔ مسلمان سائنس دانوں اور عظیم فلاسفوں کی قیمتی کتابیں یورپ کے پاس دیکھتا ہوں تو دل پر چوٹ لگتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں تو اندھیرا ہے لیکن علم کی روشنی

دوسروں کے گھروں میں اُجالا کر رہی ہے۔

اقبال اپنے مسلم نوجوانوں اور شاہین بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اقبال دُعا کرتے ہیں:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبال اپنے نوجوان سے نا اُمید نہیں ہیں، فرماتے ہیں:

نہیں نومید اقبال اپنی کشت ویراں سے

ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

❖ قومی ترانے کے الفاظ حفیظ جالندھری کے مجموعہ کلام ”چراغِ سحر“ میں ہیں۔

❖ قومی ترانے میں لفظ پاکستان صرف ایک بار آیا۔

❖ قومی ترانہ منظور کرنے والی کمیٹیوں نے 722 ترانے رد کرنے کے بعد پاکستان کا قومی ترانہ منظور کیا۔

❖ قومی ترانے کی دھن احمد جی چھاگلہ نے مرتب کی۔

❖ پاکستان کا قومی ترانہ شاعری کی صنف ”مخمس“ میں لکھا گیا۔

❖ قومی ترانہ پہلی بار 13 اگست 1954ء کو ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا۔

❖ قومی ترانہ مرتب کرنے میں کل 21 آلات اور 38 ساز ہیں۔

❖ پورا قومی ترانہ بجنے میں کل ایک منٹ اور بیس سیکنڈ کا وقت لگتا ہے۔

❖ امریکہ کی مشہور فلم ساز ادارے نے 19 جنوری 1955ء میں قومی ترانہ کی رنگین فلم تیار کی۔

❖ قومی ترانے میں کل 15 مصرعے ہیں۔

❖ حکومت پاکستان نے قومی ترانے کے حقوق حفیظ جالندھری سے اگست 1955ء میں خریدے۔

(سید حمزہ طارق، منڈی بہاؤ الدین)

جنگلی گلابوں والا برفانی تودا

سیا چین



رانا محمد شاہد

اس کا درجہ حرارت منفی 16 سے 32 تک ہوتا ہے جب کہ سردیوں میں منفی 30 سے 50 تک چلا جاتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گرمی کے موسم میں بھی یہاں کی سردی برداشت نہیں ہوتی۔ موسم کی اس شدت میں زندگی نہیں ہوتی۔ 75 کلو میٹر طویل اور 4.8 کلو میٹر چوڑے سیاچین کے علاقے میں آج تک گھاس کے ایک پتے نے جنم نہیں لیا۔ یہاں سے کسی جانور اور پرندے کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ سیاچین گلیشیئر کو پاکستان کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے دنیا بھر سے جتنی بھی کوہ پیما ٹیمیں اس علاقے کی چوٹیاں سر کرنے کے لیے آئیں، ان سب نے حکومت پاکستان سے ہی اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ لمبائی کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے بڑے گلیشیئر

کو سب سے پہلے ڈاکٹر سیف لانگ نے دریافت کیا تھا۔ سیاچین گلیشیئر کشمیر کی طرف سے 16 سے 22 ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ پاکستان کی طرف سے سیاچین گلیشیئر پر جانے کے لیے گلگت سے اسکروو اور اسکروو سے آگے ”ڈم سم“ کے علاقے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ یہاں سے سیاچین گلیشیئر کی بلندی اٹھارہ ہزار فٹ ہے۔ ”ڈم سم“ سے آگے ”گوما“ کا علاقہ آتا ہے پھر مختلف درے آتے ہیں۔ سب سے پہلے ”درہ سالتورہ“ پھر ”درہ بلا فونڈا“ اور پھر ”درہ گیانگ“ سے ہوتے ہوئے سیاچین تک جایا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ سیاچین پر پہنچنا اتنا آسان بھی نہیں۔ ٹھنڈی اور تیز بستی ہواؤں سے ہمت جواب دے جاتی ہے۔ پھر ان ہواؤں سے لڑتے ہوئے یہ سفر اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ منزل پر پہنچتے پہنچتے کئی دن اور کئی راتیں لگ جاتی ہیں۔ پاکستان اور چین کی سرحد پر واقع ”درہ کرلی“ سیاچین گلیشیئر کا منبع ہے۔

آپ سیاچین کی چوٹیوں پر بغیر آکسیجن ماسک کے نہیں جا سکتے بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ آکسیجن ماسک کے بغیر آپ زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہاں پر جانے کے لیے خصوصی لباس بھی درکار ہوتا ہے۔ بھاری بھر کم لباس، ہیلیمٹ اور خاص جوتوں کے

سیاچین..... بلتی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں سیاہ گلاب یا جنگلی گلاب۔ گلیشیئر تو آپ جانتے ہیں کہ برفانی تودے کو کہتے ہیں۔ یوں سیاچین گلیشیئر کا لفظی مطلب ہوا، جنگلی گلابوں والا برفانی تودا۔ سیاچین گلیشیئر 1907ء میں دریافت ہوا۔ 75 کلو میٹر لمبے اور 4.8 کلو میٹر چوڑے اس گلیشیئر پر کوئی انسانی آبادی نہیں۔ سیاچین دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو سے 70 کلو میٹر جنوب مشرق میں پاک چین سرحد پر واقع درہ اندرہ کول سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ جنوب مشرق کی سمت سالتورہ رینج کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے لداخ کے قریب مقبوضہ کشمیر میں واقع رنگز لما نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب دریائے نبرا میں ڈھل جاتا ہے۔

سیاچین گلیشیئر یا برف زار سطح سمندر سے 18875 فٹ بلند ہے۔ امریکی خلائی ادارے ناسا (NASA) کے اعداد و شمار کے مطابق سیاچین کی طرف کا حجم 2 ٹریلین مکعب فٹ ہے۔ سیاچین دنیا کا دوسرا طویل ترین گلیشیئر ہے اور یہ دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ ہے۔ پاکستان کے اس دوسرے بڑے گلیشیئر کی تمام کی تمام جگہ برفیلی ہے۔ اسے برف کا دوزخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ گرمیوں میں

بغیر بھی آپ وہاں چند سکینڈ نہیں گزار سکتے۔ منفی 40 درجہ حرارت پر دُنیا کے تمام مائع جم جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ جسم کے کسی بھی حصہ کو ننگا نہیں کر سکتے۔ اس کم ترین درجہ حرارت میں جسم ننگا کرنے کا مطلب موت ہے۔ انگلی باہر نکالیں گے تو انگلی جڑ سے غائب اور اگر ہیلیمٹ اتارتے ہیں تو بھی گردن سے لے کر بال تک جم جاتے ہیں۔ چند گھنٹے منفی 40، 50 درجہ حرارت پر چلتے ہیں تو پاؤں ٹخنے سے شل ہو جاتا ہے اور پھر پاؤں کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ سیاچین کے آخری میدان کے متعلق تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہاں تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود 20 دن سے زیادہ زندہ نہیں رہا جاسکتا۔ اس لیے وہاں 20 دنوں کے بعد نئے فوجیوں کو بھجوا دیا جاتا ہے لیکن سخت سردی کی شدت دیکھیے کہ ان میں بھی بہت سے ”سنو بائیٹ“ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ آنکھ، کان، ہاتھ یا ٹانگ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ سنو بائیٹ کا مطلب ہے کہ یہاں سردی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ہاتھ بغیر دستانے کے کسی چیز کو چھو جائے تو وہاں کا دوران خون رک جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خون جم گیا ہے اور ہاتھ سُن ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کا نام ”سنو بائیٹ“ ہے۔ ایسی صورت حال میں ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے اور بالآخر اسے کاٹنا پڑتا ہے۔

سیاچین کی لمبائی 75 کلومیٹر سے زائد جب کہ چوڑائی 4.8 کلومیٹر ہے۔ یہ دُنیا کا بلند ترین محاذ جنگ ہے جہاں انسان کا مقابلہ انسان سے ہی نہیں بلکہ موسم کے بے رحم تھپیڑوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس علاقے کی سیدھی اور سپاٹ چڑھائیاں برف سے اُٹی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چلتے ہوئے پاؤں زمین پر نہیں ہوتے بلکہ برف میں دھنس جاتے ہیں۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری پیش آتی ہے جس سے قوتِ مدافعت میں بھی فرق پڑتا ہے۔ بعض اوقات سومیل فی گھنٹا کی رفتار سے برفانی جھکڑ بھی چلتے ہیں۔ جب سیاچین پر ہیلی کاپٹر لینڈ کرتا ہے تو اس کے انجن کو بند نہیں کیا جاتا بلکہ شارٹ ہی رکھتے ہیں کیوں کہ خدشہ ہوتا ہے کہ آکسیجن کی کمی ہونے کی وجہ سے اگر انجن بند کر دیا تو کہیں دوبارہ شارٹ ہی نہ ہو۔

سیاچین پر فوجیوں کے لیے فائبر گلاس کے چھوٹے چھوٹے خیمے نصب ہوتے ہیں۔ فوجیوں کی خاص وردی اور خاص جوتے نہ ہوں تو زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فوج کے آپس میں رابطے کے لیے ٹیلی فون لائنیں نصب ہیں جو کئی کئی فٹ برف کاٹ کر بچھائی گئی ہیں۔ اگر احتیاط نہ کی جائے تو شدید قسم کے امراض جن میں ”پلموزی اوڈیم“ اور ”برین اوڈیم“ شامل ہیں، کے حملے ہو سکتے ہیں۔ ان میں جسم کے مختلف حصے مفلوج ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں انسان کے پھیپھڑوں میں خون کی نالیوں میں ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ خون پھیپھڑے کی نالیوں سے باہر آ جاتا ہے۔ یوں پھیپھڑوں میں خون بھر جاتا ہے۔ ایسے مریض کو اگر فوری طور پر آکسیجن مہیا نہ کی جائے تو موت کا شدید خطرہ ہوتا ہے۔

سیاچین میں بعض چیک پوسٹ ایسی ہیں جہاں پر بنائے گئے ”اگلو“ میں چار پانچ لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اگلو کیا ہے؟ اگلو برف کے اس گھر کو کہتے ہیں جو برف کا ہی بنا ہوتا ہے اور اس کے اندر کا درجہ حرارت ایسا رکھا جاتا ہے کہ زندہ رہا جاسکے۔ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ سوتے میں ٹانگیں ایک دوسرے پر رکھنا پڑتی ہیں۔ یہاں کی سب سے خطرناک چیک پوسٹ یوسف چیک پوسٹ ہے جس کی بلندی 21 ہزار فٹ ہے۔ ایک فوجی افسر جو اس چیک پوسٹ سے معجزانہ طور پر واپس آیا، اس نے بتایا کہ میں خود اس چیک پوسٹ پر رہا، میری انگلیوں کی پوریں تک جم گئیں جب کہ میرے ساتھ جانے والے دو ساتھی شہید ہو گئے۔ میری زندگی تھی، میں بچ گیا۔

سیاچین گلشیر پر دشمن سے برسرِ پیکار اس وطن کے سپاہیوں کو پاکستانی قوم کا سلام..... کہ وہ اتنے مشکل حالات میں اپنے سے بہتر پوزیشن میں بیٹھے بدترین دشمن کا بے جگری سے مقابلہ کر رہے ہیں اور اس کے عزائم کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ سیاچین کے گیارہ سیکٹر میں گزشتہ سال ایک سو سے زائد پاکستانی فوجی جوانوں نے قوم کی غیرت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی، پاک فوج اور ان شہداء کی عظمت کو سلام۔

☆☆☆



کھیل دس منٹ کا

س	ط	گ	ن	س	ک	ا	ب	ف	ل
ا	ع	ه	ا	س	ک	و	ء	ش	و
ک	ز	ح	ک	غ	ن	م	ص	ب	ا
ب	م	ض	ر	ث	ڑ	ظ	و	ی	ل
ڈ	ل	ء	ک	ے	ڈ	ژ	ج	ڈ	ی
ڈ	ا	خ	ٹ	ف	ع	ت	ا	م	ب
ی	ب	ث	چ	ه	ا	ک	ی	ن	ا
ق	ٹ	ش	ط	ر	ن	ج	و	ٹ	ل
ب	ف	ن	ی	و	ڈ	ش	ط	ن	گ
ظ	ل	ر	ک	و	ن	س	ا	ش	ع

آپ نے حروف ملا کر کھیلوں کے دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے، وہ یہ ہیں:

کرکٹ، ہاکی، اسکولش، بیڈمنٹن، فٹ بال، اسنوکر، کبڈی، باکسنگ، شطرنج، والی بال

جھوٹوں کے بادشاہ



چلتی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اس نے چاپلوس پتھر چاٹ لیا ہے۔ اس چاپلوس پتھر کی بھی اپنی ایک روایت تھی۔ علاقے میں پرانے وقتوں کا ایک قلعہ تھا۔ اس کے شمالی دروازے کی دہلیز کے نیچے سفید رنگ کا ایک پتھر لگا ہوا تھا۔ قلعے کے بادشاہ کی خدمت میں جو شخص بھی حاضری دیتا، وہ پہلے اس پتھر کو اپنی زبان سے چاٹتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس پتھر کو چاٹتے ہی اس شخص کی زبان میں چاپلوسی یعنی خوشامد کا اثر پیدا ہو جاتا اور وہ بادشاہ کی دل کھول کر تعریف کرتا۔ اب قلعہ تو ویران ہو چکا تھا۔ اس کا شمالی، جنوبی، مشرقی، مغربی غرض کہ کوئی دروازہ بھی سلامت نہیں رہا تھا اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ پتھر اب بھی وہاں موجود ہے یا نہیں، مگر لوگوں میں یہ روایت خاصی مشہور تھی کہ لالو نے چاپلوس پتھر چاٹ لیا ہے اور کچھ زیادہ ہی چاٹ لیا ہے۔ اس لیے وہ چاپلوسی کے فن میں طاق ہو گیا ہے اور لوگ اس کی سو فی صد جھوٹی باتوں کو جھوٹی سمجھتے ہوئے بھی اس کی معمولی چیزیں مہنگے داموں خرید لیتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ لالو کی ان گپوں اور بے سروپا کہانیوں کا سلسلہ برسوں تک اسی طرح چلتا رہتا، لوگ اس کی باتیں سن کر ہنستے رہتے، ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے رہتے اور ہنسی خوشی اس کی معمولی

لالو پھیری والا گاؤں گاؤں، گلی گلی، پھر کر سودا بیچتا تھا مگر وہ اپنے سودے سے زیادہ اپنی مزے دار گپوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایسی جھوٹی اور بے سروپا کہانیاں گا کہوں کو سناتا کہ لوگ اس کی باتوں میں آکر اس کی معمولی معمولی چیزیں بھی خاصے مہنگے داموں خرید لیتے تھے۔ اس کا حساب ان مجمع بازوں کا سا تھا جو مجمع کو اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا کر راکھ کی پڑیا کو ہر مرض کی اکسیر بنا کر فروخت کرتے ہیں اور لوگ اس پڑیا کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے ہیں۔ جب بھی وہ کسی گاؤں میں قدم رکھتا تو ”لالو آیا! لالو آیا!“ کی خبر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتی اور کچھ لوگ سودا خریدنے اور کچھ صرف اس کی گپیں سننے کے لیے اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ بعض لوگ اسے لالو پھیری والا کی بجائے لالو ہیرا پھیری بھی کہتے تھے۔

لالو پھیری والے کی جھوٹی کہانیاں، گپیں اور بے سروپا باتیں اتنی مزے دار کیوں ہوتی تھیں؟ اس کے بارے میں بھی لوگوں نے کئی کہانیاں گھڑ رکھی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ لالو نے ایک خاص نسل کا کوا کھا لیا تھا۔ اب جس طرح وہ کوا ہر وقت کانیں کائیں کرتا رہتا ہے، اسی طرح لالو کی زبان ہر وقت قینچی کی طرح

معمولی چیزیں مہنگے داموں خریدتے رہتے مگر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز وہ ترنگ میں آ کر ایک بڑا بول بول بیٹھا اور اس بڑے بول کے نتیجے میں جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا، وہ کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

قلعے کے پرلی طرف، چند میل کے فاصلے پر، ایک شہر تھا۔ اس شہر کے لوگ کچھ زیادہ ہی زندہ دل واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے جھوٹ بولنے کے ایک مقابلے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ اس مقابلے میں اول آنے والے کو ایک ہزار اشرفیاں انعام میں دی جائیں گی۔

لالو پھیری والے نے یہ اعلان سنا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ تو خیر ایک قدرتی بات تھی۔ خالص سونے کی ایک ہزار اشرفیوں کا سن کر تو ہر کسی کے منہ میں پانی آ سکتا تھا، مگر لالو کا معاملہ کچھ اور تھا۔ اسے اپنے فن پر اور اپنی صلاحیتوں پر فخر تھا۔ جب اس نے مقابلے کی خبر سنی تو شیخی بگھارتے ہوئے کہنے لگا: ”یہ مقابلہ تو میں بڑی آسانی سے جیت سکتا ہوں۔ میرے مقابلے میں جھوٹ نگر کا بادشاہ بھی ہو، تو وہ بھی مجھ سے نہیں جیت سکے گا۔“

یہ جھوٹ نگر کی بات لالو پھیری والے نے اپنی طرف سے نہیں گھڑی تھی۔ پرانے قلعے کے ساتھ جو پہاڑی تھی، اس کے نیچے بونوں کی ایک بستی تھی جو جھوٹ نگر کہلاتی تھی۔

جھوٹ نگر کے بادشاہ نے جب لالو پھیری والے کی یہ شیخی بھری بات سنی تو اسے بڑا متاؤ آیا۔ اس نے کہا: ”اس لالو پھیری والے کا پیٹ جھوٹ بول بول کر اب پھول کر کپا ہو گیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہم اسے ایسا سبق سکھائیں گے جو وہ ساری عمر یاد رکھے گا۔“

ایک روز لالو پھیری والا پھرتے پھرتے تھک گیا تو قلعے کے پاس پہاڑوں کے دامن میں بڑے ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ سونے کا نہیں تھا۔ وہ تو محض تھوڑی دیر لیٹ کر سستانا چاہتا تھا مگر ہوا یہ کہ لیٹتے ہی اسے گہری نیند آ گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک عالی شان کمرے میں پایا۔ اس کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی۔ دیواریں

سونے اور چاندی کی تھیں۔ جگہ جگہ ایسے بوٹے لگے تھے جن کے پتے زمرّد کے تھے اور جن میں پھلوں کی جگہ ہیرے، لعل اور دوسرے قیمتی جواہرات لگے تھے۔ لالو حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ چھن چھن کی آواز سنائی دی۔ اس نے حیرت سے ارد گرد دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

کمرے کا سارا فرش سونے اور چاندی کے سکوں سے اٹا پڑا تھا اور ان سکوں کی چمک دمک سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ وہ بے اختیار آنکھوں کو ملنے لگا کہ کہیں یہ سب کچھ خواب تو نہیں مگر چند لمحے آنکھیں ملنے کے بعد جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو سب کچھ پہلے کی طرح وہاں موجود تھا۔ سونے چاندی کی دیواریں بھی، لعل اور زمرّد کے بوٹے بھی اور سونے چاندی کے سکے بھی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور فرش پر پڑے ہوئے سونے چاندی کے سکے اٹھانے لگا۔

لالو کا ارادہ ان سکوں سے اپنی جیبیں بھرنے کا تھا مگر ابھی اس نے سکوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ باہر بگل کی آواز سنائی دی۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو اپنے سامنے ایک تخت پر جھوٹ نگر کے بادشاہ کو بیٹھے پایا۔ یہ تخت سونے کا تھا، اور بگھی کی طرح بنا ہوا تھا۔ اس بگھی نما تخت کو چار گھوڑے کھینچ رہے تھے مگر ان چاروں گھوڑوں میں سے کسی کا قد کاٹھ بھی ایک عام کتے سے زیادہ نہ تھا۔ ”لالو پھیری والے!“ بادشاہ کی گونج دار آواز سنائی دی۔ ہم تمہیں اپنی سلطنت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ مابدولت ایک عرصے سے تم سے ملاقات کرنے کے آرزو مند تھے، کیوں کہ تم ایک ایسے شخص ہو جس نے جھوٹ بولنے کو ایک فن بنا دیا ہے۔ ہم تم جیسے فن کار کی تہ دل سے قدر کرتے ہیں۔“

یہ کہہ کر جھوٹ نگر کا بادشاہ تخت سے اتر ا اور جھک کر لالو پھیری والے کو آداب کیا۔ لالو بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جواب میں اسی طرح جھک کر آداب بجا لایا مگر اس کے ساتھ وہ چور نظروں سے بادشاہ کی طرف بھی دیکھتا رہا کیوں کہ اس کے خیال میں بادشاہ کی طرف سے اس کی تعریف صرف تعریف نہیں تھی، اس کے پیچھے اس کا کوئی اور مقصد چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا:

”بادشاہ سلامت، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ بادشاہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ ہم تو تمہیں کچھ دینا چاہتے ہیں۔ ذرا اپنے پیروں کی طرف نگاہ ڈالو۔ تمہارے بائیں پاؤں کے قریب ایک انگوٹھی پڑی ہے۔ یہ انگوٹھی ہماری طرف سے تمہارا انعام ہے، کیوں کہ تم نے جھوٹ کا سکہ بڑی کامیابی کے ساتھ دُور دُور تک چلا دیا ہے۔“

لالو پھیری والے نے حیران ہو کر نیچے نگاہ کی۔ واقعی اس کے بائیں پیر کے قریب سونے کی ایک انگوٹھی پڑی تھی۔ اس میں ایک بڑا سا ہیرا جڑا ہوا تھا جو جگ مگا رہا تھا۔ بادشاہ کی تعریفوں سے اس کا جی خوش تو ہو ہی گیا تھا، اس نے جھک کر انگوٹھی اٹھائی اور اپنی چھنگلی میں پہن لی۔ انگوٹھی اس کی انگلی میں یوں ٹھیک آئی جیسے اس کی انگلی کا ناپ لے کر بنائی گئی ہو۔ انگوٹھی پہن کر وہ آداب بجا لایا اور پھر کہا:

”حضور، میں اس انعام کا حق دار تو شاید نہیں تھا، مگر اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

”یہ کوئی انعام نہیں ہے۔“ یکا یک بادشاہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ لالو پھیری والا چونک سا گیا۔ بادشاہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم سمجھے ہو کہ دنیا میں صرف تم ہی سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ یہ انگوٹھی انعام نہیں بلکہ تمہارا غرور اور بڑے بول کی سزا ہے۔ تم اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے کبھی الگ نہیں کر سکو گے، کیوں کہ یہ سچ کی انگوٹھی ہے۔ جو کوئی بھی اسے پہنتا ہے، وہ سچ اور صرف سچ بولتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنی باقی زندگی جھوٹ کے بغیر کیسے گزارتے ہو۔“

پھر تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا جس سے لالو پھیری والے کی آنکھیں چندھیا گئیں اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ اسی بڑے درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔

”اوہ! تو یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔“ لالو پھیری والے نے سوچا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا مگر کوئی سخت سخت چیز اس کے گال میں چبھ رہی تھی۔ اس نے نیچے کی طرف نگاہ کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی چھوٹی انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی پڑی ہے، جس میں ایک بڑا سا ہیرا جڑا ہوا ہے۔

لالو پھیری والے کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا،

”ایسا نہیں ہوا تھا، یہ سچ نہیں ہے۔“

مگر اس کی زبان سے جو الفاظ نکلے، وہ یہ تھے۔ ”ایسا ہوا تھا، یہ سچ ہے۔“

یہ سچ تھا اور صرف سچ تھا اور اس کی زبان سچ بول رہی تھی۔ لالو نے انگوٹھی انگلی سے اتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگوٹھی اس کی انگلی کے ساتھ چمٹ گئی ہے اور وہ اسے کسی طرح بھی انگلی سے الگ نہیں کر سکتا۔ جھوٹ مگر کے بادشاہ نے بھی تو یہی بات کہی تھی۔ اس نے صابن بھی لگایا اور خوب زور آزمائی کی مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ انگوٹھی کو انگلی سے نہ اتار سکا۔ اس کے ساتھ ہی اس خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اب اس کی زندگی پہلے سے مختلف ہو جائے گی اور یہ تبدیلی اس کے حق میں بری ثابت ہوگی۔

اور اس کا یہ اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ اب جہاں کہیں بھی جاتا، سچ اور صرف سچ بولتا، اپنے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا کاروبار مندا پڑ گیا۔ پہلے لوگ اس کی جھوٹی باتوں میں آکر اس کی معمولی معمولی چیزیں بھی خرید لیتے تھے، اب اس کی زبان سے سچ اور صرف سچ سن کر خریداری سے ہاتھ کھینچنے لگے۔ پہلے لوگ اس کی لچھے دار باتیں سننے آتے تھے اور باتوں باتوں میں کچھ نہ کچھ خرید لیتے تھے، مگر اب اس کے پاس دوسروں کو سنانے کے لیے سچی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنا سودا لیے گاؤں گاؤں پھرتا مگر اب اسے مشکل سے کسی گاہک کی شکل نظر آتی۔

اور اسی حالت میں ایک روز اس کے قدم اسے قلعے کے پرلی طرف اس شہر میں لے گئے جہاں کے زندہ دل لوگوں نے جھوٹ کے مقابلے کا اعلان کیا تھا اور اس مقابلے میں اول آنے والے کے لیے خالص سونے کی ایک ہزار اشرفیوں کا انعام رکھا تھا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ اب وہ اس مقابلے میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہا، مگر یہ خیال ضرور تھا کہ اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے شہر میں بہت سے لوگ جمع ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں میں سے کچھ اس کی چیزیں خرید لیں۔

سے کسی گاہک کی شکل دیکھنی نصیب ہوگی۔ وہ جھپکتے جھپکتے آگے آیا اور بولا: ”مجھے افسوس ہے کہ میں اس مقابلے میں حصہ نہیں لے سکتا۔ بات یہ ہوئی کہ میں جھوٹ کے طومار باندھنے میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ جھوٹ نگر کا بادشاہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ ایک روز میں بڑے درخت کے نیچے آرام کرنے لیٹا تو میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلنے پر میں نے اپنے آپ کو زمین کے نیچے جھوٹ نگر کے بادشاہ کے محل میں پایا، جہاں سونے اور چاندی کی دیواریں آسمان سے باتیں کرتی ہیں، جہاں درختوں کے پتے زمرد کے ہیں اور جن میں پھلوں کی جگہ بڑے بڑے ہیرے، لعل اور عقیق لگے ہیں۔ یہاں تک کہ اس محل کا فرش بھی سونے چاندی کے سکوں اور جگ مگاتے ہیرے جواہرات سے پٹا پڑا ہے۔“

لالو پھیری والے کی یہ باتیں سن کر سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ لوگ اس کی باتوں کو گپ سمجھ رہے تھے۔ لالو نے اپنی بات جاری رکھی:

”جھوٹ نگر کا بادشاہ ایک تخت پر بیٹھا تھا، جو سونے کا تھا اور بگھی کی طرح تھا۔ اس کو چار گھوڑے کھینچ رہے تھے اور کسی گھوڑے کا قد بھی میری پنڈلی سے زیادہ نہ تھا۔ وہ میرے قریب آ

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو گلیاں خاموش اور سنان نظر آ رہی تھیں، کیوں کہ شہر کے تمام لوگ جھوٹوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے ٹاؤن ہال گئے ہوئے تھے۔ وہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلی قطار میں ایک کونے میں بیٹھ جائے گا اور یوں کسی کی نظر میں آئے بغیر جھوٹ بولنے کا مقابلہ دیکھتا رہے گا۔

مگر جس پہلے شخص کی نظر اس پر پڑی، اس نے چیخ کر کہا۔ ”لالو پھیری والا آ گیا! یقیناً یہ مقابلہ جیت جائے گا۔“

”ہاں، ہاں! یقیناً، یقیناً!“ ایک ساتھ بہت سی آوازیں آئیں اور اس سے پہلے کہ وہ زبان سے ایک لفظ بھی کہہ سکتا، لوگوں نے اسے اسٹیج پر پہنچا دیا۔ اب اس کے لیے کہیں چھپنے یا کھسنے کی گنجائش نہیں تھی۔

پھر مقابلہ شروع ہوا اور جھوٹے اپنی جھوٹ بھری کہانیاں ایک ایک کر کے سنانے لگے۔

لالو پھیری والے کا برا حال تھا۔ جب اس کی باری آئی تو وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہاں اس کی خوب بھد اڑے گی اور اسے جھوٹی باتیں سنانے کی وجہ سے جو شہرت حاصل ہے، آج اس کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی اور اس کے بعد شاید اسے مشکل ہی



کر تخت سے اتر اور جھک کر مجھے آداب کہا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے کچھ انعام دینا چاہتا ہے۔“

”ہا ہا ہا! ہو ہو ہو!“ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔

”دیکھا؟ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا؟“ لالو نے کہا۔

”کاش! مجھے بھی اس وقت بادشاہ کی بات کا یقین نہ آیا ہوتا، کیوں کہ اس نے مجھے سونے کی ایک انگوٹھی دی تھی جس میں ایک بڑا سا ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس نے تو یہ انگوٹھی انعام کہہ کر دی تھی مگر جب میں نے انگوٹھی انگلی میں پہن لی تب اس نے بتایا کہ یہ انعام نہیں، سزا ہے۔ اس نے کہا کہ اس انگوٹھی کو سچ کی انگوٹھی کہا جاتا ہے اور جو کوئی اسے پہنتا ہے، وہ ساری زندگی سچ اور صرف سچ بولتا ہے اور تب سے اب تک میرا یہی حال ہے۔ میں اس مقابلے میں شامل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ میری انگلی میں سچ کی انگوٹھی ہے جسے میں ہزار کوشش کے باوجود نہیں اتار سکتا۔ یہ دیکھیے۔“

لالو پھیری والے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ اوپر کیا تاکہ لوگ انگوٹھی دیکھ سکیں مگر لوگوں پر تو ہنسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ہال میں قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

”اتنا بڑا جھوٹ ہم نے آج تک نہیں سنا۔ ہا ہا ہا!“

”یہ جھوٹ کا سب سے بھاری پلندہ ہے۔ ہو ہو ہو!“

”یہ اس مقابلے کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ہی ہی ہی!“

جب سارے جھوٹے اپنے جھوٹ سنا چکے تو ججوں نے اپنا فیصلہ سنایا جو لوگوں کی توقع کے مطابق تھا۔ انہوں نے لالو پھیری والے کو سب سے بڑا جھوٹا قرار دیا تھا لیکن جب خالص سونے کی ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی لالو کو دی گئی تو وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

”جناب، یہ جھوٹ نہیں ہے!“

”جناب، میں نے سچ بولا ہے!“

”جناب، میں نے حقیقت بیان کی ہے!“

مگر کسی نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اسے ہزار اشرفیوں کا انعام قبول کرنا پڑا۔

تاہم اس طرح اسے ایک سبق ضرور مل گیا۔ اس نے آدھی اشرفیوں سے زمین خریدی، اس کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا

مکان بنایا اور باقی زمین پر کھیتی باڑی کر کے اطمینان اور فراغت سے گزر بسر کرنے لگا۔ اب اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی اور باقی آدھی اشرفیوں کا اس نے کیا کیا؟

ان آدھی اشرفیوں کو اس نے اس بڑے درخت کی جڑوں میں رکھ دیا جہاں وہ نیند کی حالت میں جھوٹ نگر کے بادشاہ کے محل میں پہنچ گیا تھا، تاکہ اس طرح جھوٹ نگر کے بادشاہ کی ناراضگی دور ہو جائے۔ جھوٹ نگر کے بادشاہ نے بھی اس کی طرف سے یہ نذرانہ قبول کر لیا تھا اور اس کے بعد وہ اسے کبھی کبھی جھوٹ نگر بلوا کر وہاں کی سیر کراتا تھا۔

مگر یہ سیر بھی ایک لحاظ سے بادشاہ کے انتقام ہی کی ایک شکل تھی، کیوں کہ لالو اگرچہ لوگوں کو وہ حالات بڑی تفصیل سے سناتا تھا جو جھوٹ نگر کی اس طلسمی سلطنت کی سیر کرتے ہوئے اس کے دیکھنے میں آتے تھے، مگر کوئی شخص بھی اس کی باتوں کو سچ ماننے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی اس کی سچی باتوں کو جھوٹ کے پلندے سمجھتے تھے اور سچ بولنے کے باوجود اسے جھوٹوں کا بادشاہ کہتے تھے۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

صفر پر آؤٹ

اگر کوئی کھلاڑی دونوں انگلیز میں صفر پر آؤٹ ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کھلاڑی نے پڑ بنایا ہے اور اگر کوئی کھلاڑی دونوں انگلیز میں پہلی گیند پر صفر پر آؤٹ ہو جائے تو اسے کنگز پڑ کہا جاتا ہے۔

جسے اللہ رکھے

1985ء میں میکسیکو شٹی میں تباہ کن زلزلے نے دو ہزار افراد کی جان لے لی، مگر خدا کی قدرت کہ ایک ہسپتال سے 50 نوزائیدہ بچے برآمد ہوئے جو صرف مٹی میں اٹے ہوئے تھے اور کوئی زخم نہ آیا۔

جنگلی آدمی

یہ نام جیل فش کی ایک خاص نسل کا ہے۔ پرتگالی جنگلی آدمی نام کی اس مچھلی کے جسم میں پانی کی مقدار 95 فیصد ہوتی ہے۔ بے اندازہ نرم و نازک ساخت ہونے کے باوجود یہ 240 ولٹ کا کرنٹ مار سکتی ہے۔ یہ عجیب و غریب حیوان اکٹھے ایک سے پانچ لاکھ کی تعداد میں سفر کرتے ہیں۔

- رجب الثانی اسلامی سال کا چوتھا مہینہ ہے جس میں حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسلام قبول کیا۔
- رجب الثانی 6 ہجری میں غزوہ ذی قرد پیش آیا۔
- مہاجرین و انصار میں مواخات (بھائی بندی) رجب الثانی میں ہوئی۔
- رجب الثانی 1 ہجری میں عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کیا۔
- عمر خیام کا مرتب کردہ کیلنڈر ”التاریخ الجلالی“ کے نام سے مشہور ہے۔ (صائمہ سلیم، لاہور)
- الزہراوی کے اصول تحقیق کے اہم سائنسی طریقے کو ”بیکن“ سے منسوب کیا گیا۔
- سورۃ المدثر کے ذریعے نبی کریمؐ کو اعلانیہ تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا۔
- اسلام کے پہلے لشکر کے سپہ سالار حضرت حمزہؓ تھے۔
- قرآن پاک میں لفظ ”ج“ وقف جائز کی علامت ہے۔
- سری لنکا جنوبی ایشیاء کا ایک ایسا ملک ہے جو مکمل جزیرہ ہے۔
- کرکٹ میں استعمال ہونے والی ”بیل“ کی لمبائی 8 انچ ہوتی ہے۔
- گرگٹ کے کان ٹانگ کے سامنے والے حصے میں بالکل گھٹنے کے نیچے ہوتے ہیں۔ (اولیس بابر، ملتان)
- کوئی صدی جمعہ، ہفتہ اور بدھ سے شروع نہیں ہوتی۔
- اسفنج ایک ایسا جانور ہے جس کے جسم میں نہ ہڈیاں ہیں نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہیں نہ ہی اس کا منہ اور ناک ہیں لیکن پھر بھی وہ زندہ رہتا ہے۔
- چمگادڑ دنیا کا واحد اڑنے والا جانور ہے جس کے دانت ہوتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے۔
- انسانی جسم میں ناخن اور بال ایسے حصے ہیں جنہیں کاٹ دیا جائے تو درد نہیں ہوتا اور نہ ہی خون نکلتا ہے۔
- شمال مشرقی جاپان کی قوم ”آئے نو“ (Ainu) کے تمام جسم پر گوریلوں کی طرح بال ہوتے ہیں۔
- چنبیلی سے پہلے پاکستان کا قومی پھول نرگس تھا۔
- واپڈا ہاؤس لاہور کی گیارہ منزلیں ہیں۔ (حسین علی، حیدر آباد)
- باسکٹ بال کے کھیل کا مطلب ہے ”گیند ٹوکری کے اندر۔“
- پاکستان میں سب سے پہلے اردو کا انسائیکلو پیڈیا ”فیروز سنز انسائیکلو پیڈیا“ شائع ہوا۔
- برات سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ ”بر“ کا مطلب دولہا اور ”ات“ کا مطلب ہے آمد، یعنی دولہا کی آمد۔
- سندھی زبان کے کل حروف تہجی 52 ہیں۔
- قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے گاڑھا مغزیا گودا۔
- شعر کے پہلے مصرعے کے پہلے رکن کو صدر کہتے ہیں۔
- چین کا قدیم ترین نام Cathy ہے۔
- دنیا کی سب سے طویل معلق (Hanged) سڑک امریکہ میں واقع ہے۔ (نیل عارف، کراچی)
- عرب کے جغرافیہ دان بحر اوقیانوس کو بحر ظلمات کا نام دیتے تھے۔
- انسان کے سر میں بائیس ہڈیاں ہوتی ہیں۔
- زرتشت کا کلام جو نظم میں ہوتا ہے اسے گاتھا کہا جاتا ہے۔
- سکھ مذہب واحد مذہب ہے جس میں تمباکو کو حرام قرار دیا گیا ہے۔
- جھیلوں کی سر زمین فن لینڈ کو کہا جاتا ہے۔
- عرب لیگ کا قیام 1945ء میں عمل میں آیا۔
- انسانی جسم کی سب سے کمزور ہڈی ہنسی کی ہوتی ہے۔
- چاند کی سطح پر رات کے وقت درجہ حرارت منفی 150 درجے ہوتا ہے۔ (محمد ابوذر، شکار پور)
- زمین کا رقبہ چاند سے 13 گنا زیادہ ہے۔
- سمندر میں مد و جزر چاند کی کشش کی وجہ سے ہوتا ہے۔
- جزیرہ سمائرا بحر ہند میں واقع ہے۔
- پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہے۔
- دنیا کا سب سے قدیم ترین کھیل ہاکی قرار دیا جاتا ہے۔
- پاکستان اور کشمیر کی سرحد پر بلند ترین پہاڑ نیلا بٹ ہے۔
- سعودی عرب کا موجودہ نام 21 ستمبر 1932ء کو رکھا گیا۔
- 18 جولائی 1918ء کو دنیا کی عظیم سیاسی شخصیت نیلسن مینڈیلا پیدا ہوا۔ (حنامشا، گجرات)

صاحب نے جب شعر کہنا شروع کیے تو وہ اشعار فارسی زبان ہی میں تھے۔

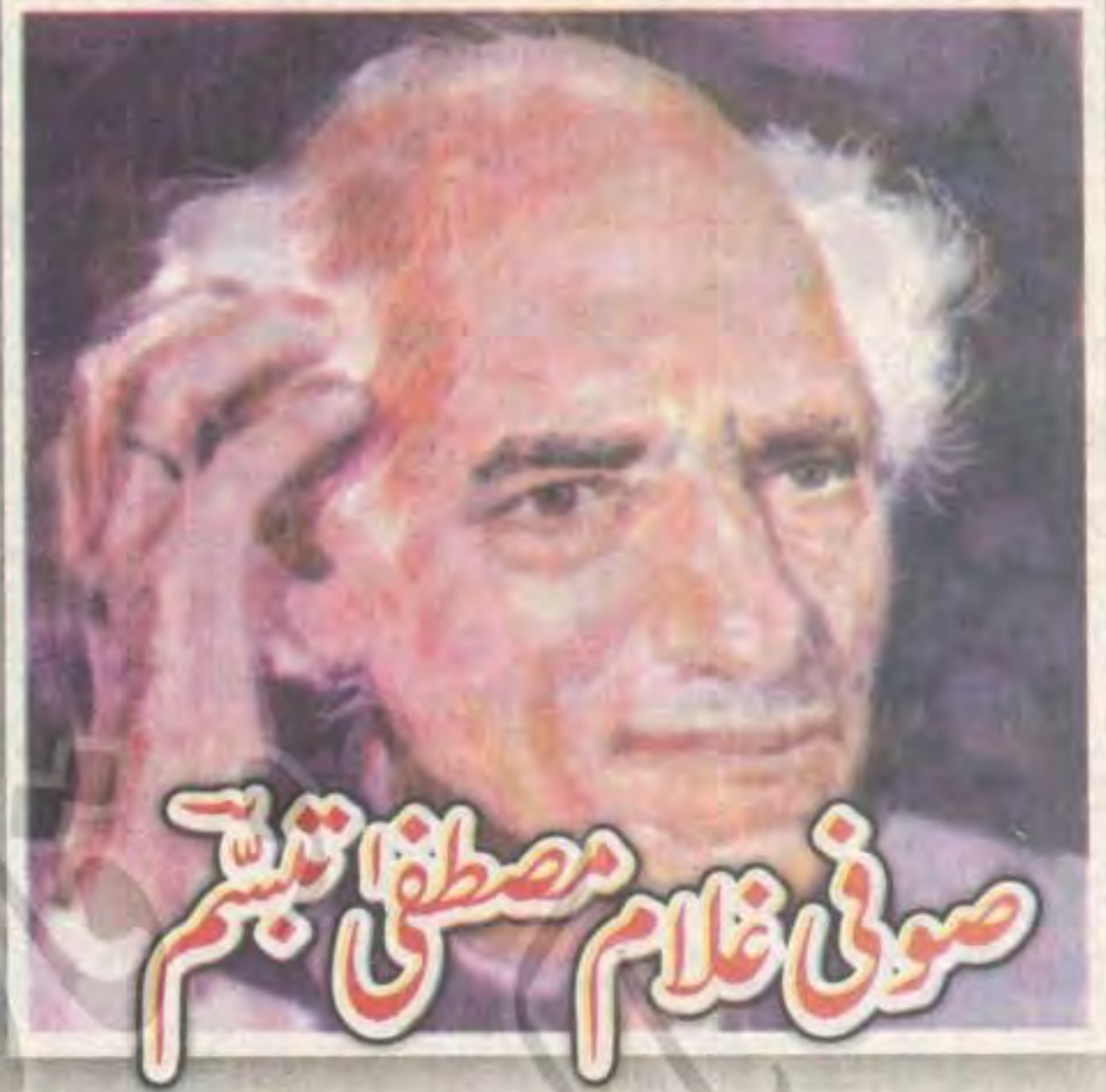
صوفی تبسم بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار یہ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ میرے بچے اپنی اماں اور دادی جان سے کہانیاں سنتے مگر آخر ایک دن ان کی والدہ نے انہیں میری طرف بھیجا کہ جاؤ والد سے کہانی سنو۔ میں نے دو چار دن تو کہانی سنائی مگر پھر میں نے بچوں سے کہا کہ میں آپ کو نظم سنا سکتا ہوں اور یوں انہوں نے اپنی بیٹی ثریا اور عذرا کے لیے نظمیں لکھیں۔

ثریا کی گڑیا نہانے لگی
نہانے لگی ڈوب جانے لگی
بڑی مشکلوں سے بچایا اسے
کنارے پہ میں کھینچ لایا اسے
انہوں نے بچوں کے لیے جھولنے، سنوگپ شپ، ٹول مٹول اور ٹوٹ بٹوٹ لکھیں۔

صوفی صاحب ریٹائر ہونے کے بعد خانہ فرہنگ ایران کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس کے بانی خود صوفی صاحب تھے۔ آپ نے لوگوں میں فارسی کا ذوق پیدا کرنے کے لیے بے انتہا کام کیا۔ اسی دوران صوفی صاحب سول سروسز اکیڈمی اور فنانس سروسز اکیڈمی میں بھی معلم تھے۔ ”لیل و نہار“ میں ان کا ایک کالم ”حرف و سخن“ کے نام سے چھپتا رہا جو بے حد مقبول تھا۔ مقتدرہ قومی زبان سے کئی لفظوں کے اردو میں خوب صورت تراجم کیے۔ صوفی صاحب مینار پاکستان کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ وہ پہلے چیئرمین پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ تھے۔ وہی پہلی بار پاکستان کرکٹ ٹیم کو انڈیا میچ کھیلنے لے کر گئے۔

صوفی صاحب ریڈیو پاکستان سے بطور مشیر اعلیٰ وابستہ ہو گئے اور ریڈیو پاکستان میں بطور مشیر اعلیٰ نہایت تندہی اور مستعدی سے کام کرتے رہے۔

1965ء کی جنگ میں کئی جنگی ترانے لکھ کر اہم قومی فریضہ سرانجام دیا۔



شاعر، نقاد اور ادیب صوفی غلام مصطفی تبسم 4 اگست 1899ء کو امرتسر کے ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مشن اسکول سے میٹرک اور خالصہ کالج امرتسر سے ایف اے کیا۔ پھر لاہور آ کر ایف سی کالج سے بی اے اور اسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ پھر سنٹرل ٹریننگ کالج سے بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ آپ گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول میں بطور مدرس مقرر ہوئے اور تین برس بعد سنٹرل ٹریننگ کالج میں بطور لیکچرار تعینات ہوئے۔ اس کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی اور اردو شعبہ کے سربراہ مقرر ہوئے اور اسی کالج سے 1954ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس دوران انہوں نے ہزاروں طلباء کو اردو اور فارسی کی تعلیم دی۔

صوفی تبسم کا تخلص ابتداء میں کچھ عرصہ اصغر صہبائی بھی رہا مگر ان کے استاد حکیم فیروز الدین طغرانی نے یہ تخلص اس لیے بدلا کہ صوفی صاحب سراپا متبسم رہتے تھے لہذا انہوں نے ان کا تخلص تبسم تجویز کیا۔ صوفی صاحب نے طالب علمی کا ابتدائی زمانہ امرتسر میں گزارا اور دادا کی تربیت میں رہے۔ صوفی صاحب کے دادا کا بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ میں فارسی اور اردو کی نادر کتابیں موجود تھیں۔ صوفی صاحب اس نادر علمی سرمایہ سے خوب فیض یاب ہوئے ان میں فارسی شعراء کے دیوان بھی تھے۔ صوفی صاحب کو بچپن ہی سے فارسی شاعری کا ذوق و شوق تھا یہی وجہ ہے کہ صوفی

انڈے اتنے چنگے ہیں پاؤں میرے ننگے ہیں
کیسی باتیں کرتی ہیں انڈے پیچو جوتا لو

عذرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے
گھنٹی بجاؤ اس کو جگاؤ
توبہ ہے میری میں نہ جگاؤں
وہ رو پڑے گی مجھ سے لڑے گی

ایک تھا تیر، ایک بیڑ لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہو گئی گم ایک کی چونچ اور ایک کی دم

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بوٹ باپ تھا اس کا میر سلوٹ
پیتا تھا وہ سوڈا واٹر کھاتا تھا بادام اخروٹ
ایک تھا لڑکا ٹوٹ بوٹ

ٹمک ٹالا ٹمک ٹالا بلی کا منہ ہو گیا کالا
مرغی مرغی بولی غوں غوں غوں
چوزہ بولا چوں چوں چوں
مرغا بولا گلڑوں کوں

آبا آبا آبا آبا
منا منا ایک اور لڈو لڈو
اک لڈو منے نے کھایا دوسرا منا دوڑا آیا
آبا آبا آبا آبا
لڈو لڈو ایک اور منے دو

سنوگپ شپ، سنوگپ شپ ناؤ میں ندی ڈوب چلی
شیر اور بکری مل کر بیٹھے گھوڑا گھاس نہ کھائے
تینوں اپنی ضد کے پورے کون کسے سمجھائے
سنوگپ شپ، سنوگپ شپ ناؤ میں ندی ڈوب چلی

”اے پتر ہٹاں تے نہیں ویکدے“

”میریا ڈھول سپاہیا“

”کرنیل کرنیل کرنیل کرنیل“

”اے ہواؤں کے مسافر“

اے سمندروں کے راہی

میرے سر بکف مجاہد

میرے صف شکن سپاہی“

صوفی صاحب کی بہت سی غزلیں مختلف گلوکاروں نے گائیں
جو بے انتہا مقبول ہوئیں۔

”وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ“

”یہ آج کون خراماں ادھر سے گزرا ہے

جبین شوق ہے بے تاب نقش پا کے لیے“

آپ نظم و نثر کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا شعری
کلام انجمن، سو بارچمن مہکا، صد شعر اقبال، شرح غالب، دوگونہ
شائع ہو چکی ہیں۔ انہیں غالب اور اقبال کے کلام پر زبردست عبور
حاصل تھا۔ صوفی صاحب کو حکومت ایران نے نشان فضیلت سے
نوازا۔ حکومت پاکستان نے انہیں تمغہ حسن کارکردگی اور تمغہ امتیاز
سے بھی نوازا۔ انہوں نے 7 فروری 1978ء میں وفات پائی۔
انہوں نے بچوں کے لیے دلچسپ نظمیں لکھیں۔

کرے ٹرے، کرے ٹرے تری تری، تری موٹر
چلے چھم چھم، چلے چھم چھم، مری ٹم ٹم

چچوں چچوں چاچا گھڑی پہ چوہا ناچا
گھڑی نے ایک بجایا چوہا نیچے آیا

ٹمک ٹمک ٹمک ٹمک تیری چڑیا کی اک دم
میری مینا کے دو پر ایک ادھر اور ایک ادھر
تیری چڑیا شور مچائے میری مینا گانا گائے

مرغے میں نے انڈا دیا مرغی تو نے خوب کیا

سردار (ڈاکٹر سے): میرا وزن بہت بڑھ گیا ہے میں کیا کروں؟
ڈاکٹر: تم روزانہ 5 کلو میٹر پیدل چلا کرو۔

سردار (6 مہینے کے بعد ڈاکٹر سے): ڈاکٹر! تیرا ستیاناس ہو، میرا وزن کم ہو گیا ہے، مگر میں افغانستان پہنچ گیا ہوں۔

(آمنہ افضل، چکوال)

استاد (شاگرد سے): تو آج کا سبق یہ ہے کہ سعودی عرب کا دارالحکومت ریاض ہے۔

شاگرد: جناب! ریاض تو میرا بھائی ہے۔

(فاطمہ جہاں، کراچی)

ایک گنجاریل میں سفر کر رہا تھا۔ ریل میں بھیڑ بہت زیادہ تھی۔

ایک نوجوان گنچے کی طرف بڑھا۔ گنجاریل بگڑ کر بولا:

ارے بھائی کیا تم میرے سر پر بیٹھو گے؟

نوجوان: اجی جناب! مجھے کیا پھسل کر مرنا ہے۔

(سلمان احمد، ملتان)

ایک ہوائی جہاز پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ایک مسافر نے پائلٹ

سے پوچھا: کیوں بھیڑی، جہاز میں پٹرول تو کافی بھرا لیا ہے نا؟

پائلٹ نے کہا: لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟

مسافر: اس لیے کہ اگر راستے میں پٹرول ختم ہو جائے تو آپ یہ نہ

کہیں کہ چلو اتر کر جہاز کو دھکا لگاؤ۔

(محمد حارث سعید، بورے والا)

ناصر روتا ہوا اسکول سے گھر آیا تو ماں نے پوچھا:

بیٹے! کیوں رو رہے ہو؟

ناصر (ہچکیاں لیتے ہوئے) بولا: ماسٹر صاحب نے مارا ہے۔

ماں: کیوں مارا ہے؟

ناصر: ماسٹر صاحب کی کرسی پر روشنائی گری ہوئی تھی۔ وہ بیٹھنے لگے تو

میں نے سوچا کہ کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ میں نے پیچھے سے

کرسی کھینچ لی۔

(احسن آفاق، کراچی)

استاد (شاگرد سے): سرگرم کو فقرے میں استعمال کرو۔

شاگرد: گرمیوں میں ننگے سر پھرنے سے سرگرم ہو جاتا ہے۔

(عائشہ تنویر، راول پنڈی)



گاؤں میں ایک بھیڑیا گھس آیا۔ سارے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔

ایک بہت موٹی عورت نے اپنے خاوند سے کہا:

آؤ ہم بھاگ چلیں، کہیں بھیڑیا ہمیں اٹھا کر نہ لے جائے۔

شوہر: ڈرو مت، وہ بھیڑیا ہے کوئی کرین نہیں۔

(محمد حمزہ سعید، بورے والا)

باپ: بیٹا! کیا تم اسکول میں کسی چیز میں اوّل آئے ہو؟

بیٹا: جی ہاں! جب چھٹی کی گھنٹی بجتی ہے تو سب سے پہلے میں ہی

باہر آتا ہوں۔

ایک دوست: اگر رات کو نیند نہ آئے تو.....؟

دوسرا دوست: اس کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی سو جائے۔

(عظمیٰ شہزادی، گجرات)

نج (ملزم سے): تم نے جوہری کی دکان سے زیورات کیوں چرائے؟

ملزم: جناب، دکان کے شوروم پر لکھا تھا کہ سنہری موقع سے فائدہ

اٹھائیے۔

(حسین ابن علی جعفری، اسلام آباد)

دکان دار: چاول لے لو! چاول لے لو!

گاہک: بھائی تم تو انگور بیچ رہے ہو تو چاول لے لو کی صدا کیوں لگا

رہے ہو؟

دکان دار: چپ کرو! اگر کھیوں کو آواز آگئی تو سارے انگور کھا

جائیں گی۔

(نصیبہ ناز، سرائے صالح)

باپ (بیٹے سے): بیٹا! الف سے کیا آتا ہے؟

بیٹا: ابا جان! الف سے کچھ نہیں آتا، سب کچھ پیوں سے آتا ہے۔

(ناہید خان، کراچی)



میری زندگی کے مقاصد



محمد مغیث خان، صادق آباد
میں پاک فضائیہ میں شامل ہو کر
ملک کی حفاظت کروں گا۔



محمد شاہ زیب اظہر، اسلام آباد
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت
علاج کروں گا۔



بلال ضیاء، لاہور
سی ایس ایس کر کے قوم کی خدمت
کرنا چاہتا ہوں۔



احسن شہزادی، گجرات
میں ڈاکٹر بن کر دیکھی لوگوں کی
خدمت کروں گی۔



محمد سعد فیصل، گوجرانوالہ
میں پاکستان ائرفورس میں شامل ہو
کر ملک و قوم کی حفاظت کروں گا۔



زارا وہاب، اسلام آباد
میں خلا باز بنوں گی اور چاند پر
پاکستان کا جھنڈا لہاؤں گی۔



مہدی شفیق، لاہور
معاشرے کا مفید شہری بن کر ملک
و قوم کی خدمت کروں گا۔



محمد افضل انصاری، لاہور
میں اردو کا پروفیسر بن کر اسے
سرکاری زبان کی حیثیت دلاؤں گا۔



زین العابدین، چانڈیاں شریف
میں ایک بڑا مصور بن کر ملک کا نام
روشن کروں گا اور والدین کی خدمت
کروں گا۔



ماہن فاطمہ، لاہور
میں استاد بن کر محذور بچوں کو تعلیم
دوں گی۔



محمد وقاص، دریا خان
میں انجینئر بن کر ملک اور والدین کا
نام روشن کروں گا۔



جواد علی، فیصل آباد
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گا۔



عدین فاطمہ، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گی۔



شازم نصیر، فیصل آباد
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گا۔



محمد آصف جمال، لاہور
میں استاد بن کر پاکستان سے
جہالت دور کروں گا۔



رباب ملک، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گی۔



سائرہ نسیب، ملتان
میں استاد بن کر غریبوں کو مفت تعلیم
دوں گی۔



نعمان صفدر، انک
میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت
کروں گا۔



مارووف ملک، لاہور
میں استاد بن کر ملک سے جہالت
دور کروں گی۔



محمد عمر شفقت، لاہور
ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا
چاہتا ہوں۔



عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میں ڈاکٹر بن کر دیکھی انسانیت کی
خدمت کرنا چاہتی ہوں۔



محمد عبداللہ حسام، لاہور
میں پائلٹ بنوں گا۔



حمزہ شیر، لاہور
میں قرآن پاک حفظ کر کے دین
اسلام کی نشر و اشاعت کروں گا۔



طلحہ تنویر، نوشہرہ
میں پائلٹ بنوں گی اور ملک کا نام
روشن کروں گا۔



وحیدہ بابر شفیق، بھولوال
میں استاد بنوں گی اور علم کی روشنی
پھیلاؤں گی۔

رکھا ہے۔ اس مینار کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں ہرن کی قبر بھی موجود ہے اور تالاب میں پانی کا نظام بھی ہے۔ آج بھی بچے بڑے اس ہرن مینار کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

گندم

گندم (Wheat) کا شمار مکئی اور چاول کے بعد سب سے زیادہ کھائی جانے والی فصل میں ہوتا ہے۔ اس کا سائنسی نام *Triticum Aestivum* ہے جس کا تعلق *Poaceae* خاندان سے ہے۔ اس کا تنا تین سے ساڑھے تین فٹ لمبا ہوتا ہے جس پر نجلی طرف پتا لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ گندم کے سٹے کو *Spikelet* کہا جاتا ہے۔ گندم کے بیجوں کو پیس کر آٹا بنایا جاتا ہے جو روٹی، ڈبل روٹی، بسکٹ، گوکیز، کیک، پاستا، نوڈلز، الکوحل اور بائیو فیول کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ گندم کے تنکے رسی اور چھتوں کی تعمیر میں استعمال ہوتے ہیں، جب کہ توڑی جانور کھاتے ہیں۔ ہزاروں برس سے انسان گندم کی کاشت کر رہا ہے۔ آج دنیا بھر کے 240,000,000 ہیکڑ یا 590,000,000 ایکڑ سے زائد رقبے پر یہ کاشت ہو رہی ہے۔ خیال ہے کہ شام،



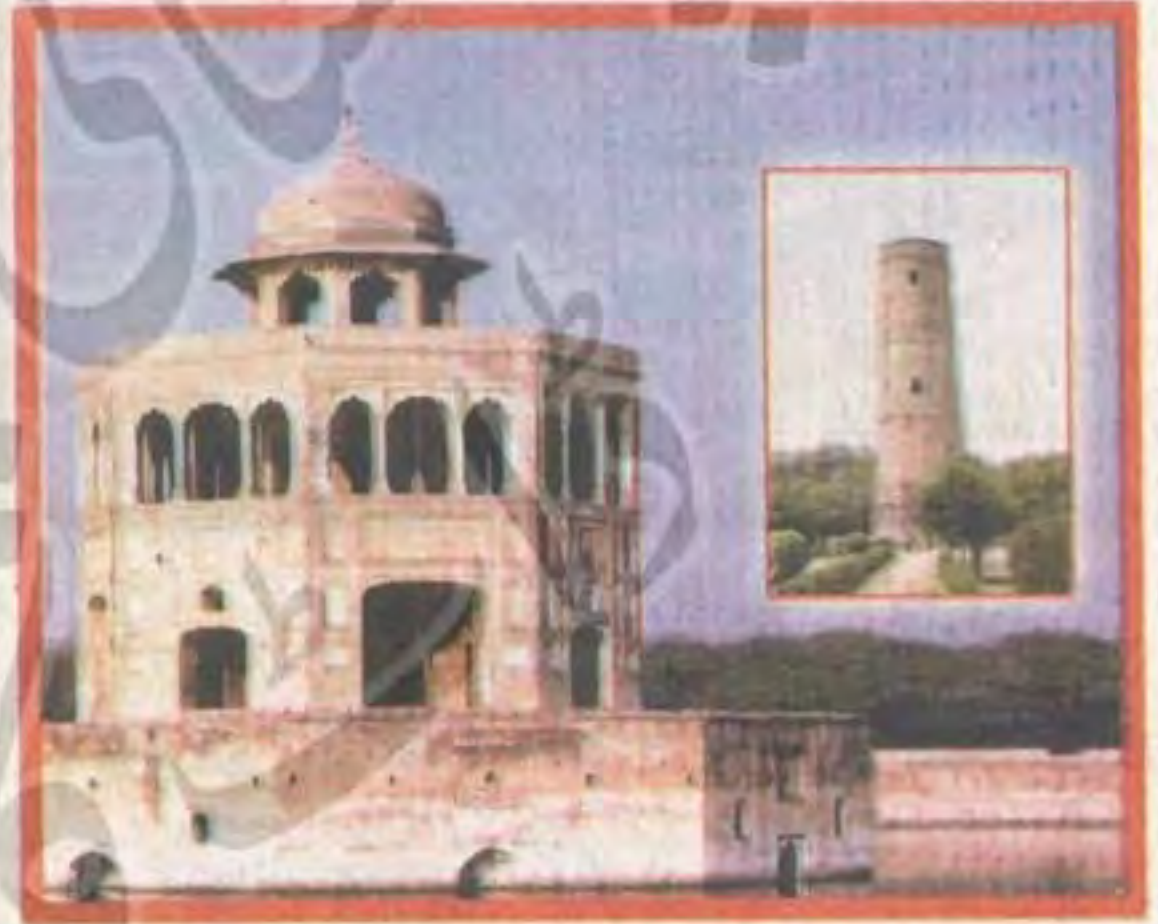
لبنان، اردن اور عراق کے کسی علاقے سے اس کی کاشت کا آغاز ہوا۔ گندم میں کاربوہائیڈریٹس، ریشے، تھائی مین، رابو فلیون، وٹامن بی، کمیشیم، میکینشیم، فاسفورس، پوٹاشیم، زنک، میکیز کے علاوہ پروٹین بھی پائی جاتی ہے۔ چین، بھارت، امریکہ، روس، فرانس، جرمنی اور پاکستان دنیا کے سب سے زیادہ گندم پیدا کرنے والے

ڈاکٹر طارق ریاض خان



ہرن مینار

لاہور سے 40 کلومیٹر کے فاصلے پر ضلع شیخوپورہ میں عظیم الشان تاریخی ہرن مینار ہے جسے مغل شہنشاہ جہانگیر نے اپنے ہرن کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ شکار کر رہا تھا کہ غلطی سے اپنے



ہرن Mansraaj کو تیر مار بیٹھا۔ چنانچہ 1606ء میں یہ مینار تعمیر ہوا۔ اس مینار کی بلندی 108 فٹ تھی لیکن اب اس کا اوپر والا حصہ منہدم ہو گیا ہے۔ اب یہ 30 میٹر (100 فٹ) رہ گیا ہے۔ اس پر چڑھنے کے لیے گھومتی ہوئی (بل دار) 108 سیڑھیاں ہیں کیوں کہ 1605ء سے 1627ء تک مغل حکمران شیخوپورہ میں شکار کرنے آتے تھے۔ اس لیے بعد میں مغل شہنشاہ شاہ جہان نے مینار کے سامنے واٹر پروف بارہ دری کا اضافہ کیا۔ مینار کے ہر سو پانی کے تالاب ہیں۔ تالاب کے ہر کونے کی جانب ایک سرخی مائل اینٹوں کی عمارت بھی موجود ہے جسے کیکر کے گھنے درختوں نے گھیر

ممالک ہیں۔ دنیا کی مختلف غذائی کمپنیاں گندم کے پودے کو بطور نشان (Insignia) بھی استعمال کرتی ہیں۔

کینیڈا کے Charles Fenerty اور جرمنی کے F.G.Keller نے کاغذ بنانے والی مشینیں ایجاد کیں۔ پاکستان میں 49 کارخانے کاغذ بناتے ہیں۔ چین، امریکہ، جاپان، جرمنی اور کینیڈا دنیا میں سب سے زیادہ کاغذ بنانے والے ممالک ہیں۔

پاؤنڈ اسٹرلنگ

دنیا کے کئی ممالک کی کرنسی پاؤنڈ ہے۔ برطانیہ کی سرکاری کرنسی پاؤنڈ اسٹرلنگ (Pound Sterling) کہلاتی ہے۔ ایک پاؤنڈ میں ایک سو Pence ہوتے ہیں۔ ایک سکے کو Penny



کہا جاتا ہے۔ ڈالر، یورو، جاپانی ین کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ لین دین پاؤنڈ اسٹرلنگ میں ہوتا ہے۔ اسے Stg یا Ster سے ظاہر کیا جاتا ہے، جب کہ کرنسی کی علامت £ ہے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین کرنسی ہے جسے بادشاہ Offa نے متعارف کروایا۔ Mercia کا یہ بادشاہ 757ء کو پیدا ہوا اور جولائی 796ء میں فوت ہوا۔ ابتدا میں چاندی کے 240 سکے ایک پاؤنڈ کے برابر ہوتے تھے۔ 1694ء میں بینک آف انگلینڈ نے کاغذ کا نوٹ شائع کیا۔ 1745ء تک پاؤنڈ کی مالیت 20 سے 1000 تک کی تھی، تاہم 1855ء سے 5، 10، 20، 50، 100، 300، 500 اور 1000 مالیت کے پاؤنڈ اسٹرلنگ شائع کیے جانے لگے۔ آج کل 155 پاکستانی روپوں کا ایک پاؤنڈ ملتا ہے۔ کرنسی پر ملکہ کا عکس شائع کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید سے لے کر کرنسی نوٹ تک، اخبارات، کتب و رسائل، کاپیاں وغیرہ سب کاغذ پر چھپتے ہیں۔ درحقیقت کاغذ سیلولوز

کاغذ

(Cellulose) کے ریشوں (Fibres) کو خاص دباؤ پر لا کر بنایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ سیلولوز کاربوہائیڈریٹس کی ایک قسم ہے جو پودوں کے خلیوں میں سیل وال بناتی ہے۔ خیال ہے کہ کاغذ (Paper) بنانے کا آغاز چین سے ہوا۔ یہ 105ء میں ہونان (Hunan) میں پیدا ہونے والے کائی لون (Cai Lun) نے کیا۔ 800ء میں مسلمان تاجر اس تکنیک کو بغداد، دمشق اور قاہرہ میں لے گئے۔ مسلمانوں نے کاغذ سازی میں نئی جدت سے کام لیا۔ قدیم مصریوں نے گھاس Cyperus Papyrus پودے کو پہلی بار کاغذ سازی میں کامیابی سے استعمال کیا۔ اسی لیے انگریزی میں کاغذ کو پیپر (Paper) کہتے ہیں۔ کاغذ کی موٹائی کو Caliper کی مدد سے ماپا جاتا ہے۔ کاغذ 0.07 ملی میٹر سے 0.18 ملی میٹر موٹا ہوتا ہے۔ ٹشو پیپر کی کثافت (Density) 250kg/m³ سے اچھے کاغذ کی کثافت 1500kg/m³ جب کہ اشاعتی کاغذ کی کثافت 800kg/m³ ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں 35 فی صد کاغذ درختوں کو کاٹ کر بنایا جاتا ہے۔ 1844ء میں



30

انعامی سلسلہ سوال یہ ہے کہ.....!

- ۱۔ بچوں کی نظموں کی کتاب ”ٹوٹ بٹوٹ“ کس نے لکھی ہے؟ ۲۔ قرآن پاک میں لفظ ”ج“ کس بات کی علامت ہے؟
 - ۳۔ بوعلی سینا کہاں پیدا ہوئے؟ ۴۔ سیاحتیں گلشن کب دریافت ہوا؟
 - ۵۔ حضرت سلمان فارسی کہاں کے رہنے والے تھے؟ ۶۔ ”الْفَتْاحُ جَلَّ جَلَالُهُ“ کا کیا مطلب ہے؟
- درج بالا سوالوں کے جوابات اپریل 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجیے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

مارچ 2013ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

- 1۔ وریشا جاوید، سیالکوٹ کینٹ۔
- 2۔ عزیز احمد، نوشہرہ۔
- 3۔ عائشہ وحید، بہاول پور۔

آئیے عہد کریں

کوچن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2013ء ہے۔

نام: _____ مقام: _____
میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ _____
موبائل نمبر: _____

ہر محل کے ساتھ کوچن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اپریل 2013ء ہے۔

کھوج
لگائیے

نام: _____ شہر: _____
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____

ہر محل کے ساتھ کوچن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اپریل 2013ء ہے۔

نام:

مقام:

دماغ لڑاؤ

مکمل پتا:

موبائل نمبر:

کوچن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2013ء ہے۔

سوال یہ ہے کہ.....!

نام: _____ عمر: _____
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____

میری زندگی کے مقاصد

کوچن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز تین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام: _____ شہر: _____
مقاصد: _____
موبائل نمبر: _____

مٹی کا موضوع ”پہاڑ اور گہری“ ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 اپریل 2013ء ہے۔

ہونہار مصور

نام: _____ عمر: _____
مکمل پتا: _____
موبائل نمبر: _____

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔



خیر دین گجرات کے نواحی گاؤں چک فاضل میں اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ وہ کھیتی باڑی اور زمین داری کا کام کر کے اپنی گزر بسر کرتا تھا۔ ایک روز اسے اپنے کسی عزیز کے ہاں گجرات کے قریب دریائے چناب کے دوسری طرف گاؤں میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ جانا تھا۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے کوئی پل وغیرہ نہ تھا۔ خیر دین اور دوسرے لوگ کشتیوں کے ذریعے دریا عبور کر کے جایا کرتے تھے۔ کشتی میں وزن اٹھانے کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ 60 کلوگرام ہے جب کہ خیر دین کا اپنا وزن 60 کلوگرام اور اس کے بیٹوں کا وزن 30، 30 کلوگرام ہے۔ 60 کلوگرام سے زیادہ وزن کی صورت میں کشتی کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہے۔ آپ کھوج لگائیے کہ خیر دین اور بچوں نے کس طرح دریا عبور کیا ہوگا۔



مارچ 2013ء میں شائع ہونے والے ”کھوج لگائیے“ کا صحیح جواب یہ ہے کہ آدمی کا قاتل نوکر ہے کیوں کہ اتوار کو ڈاک خانہ میں چھٹی تھی اور نوکر نے جھوٹ بولا۔

درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں۔

- | | |
|-----------------------|-----------------------------|
| 1- لاریب ملک، لاہور | 2- مبین احمد شفقت، لاہور |
| 3- مدثر محسن، خانیوال | 4- عبداللہ صدیقی، راول پنڈی |
| 5- مروہ قاسم، ملتان | |



”اللہ کے نام پہ دے دو بھائی!“

یامین جو گھر کے صحن میں بیٹھا کتاب پڑھنے میں مگن تھا، سر اٹھا کر دیکھا تو ایک مائی اور اس کے ساتھ تین چھوٹے چھوٹے بچے ان کے گھر کے دروازے پر کھڑے مدد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

یامین نے اسے بری طرح سے دھتکار دیا تھا اور وہ مائی بچوں سمیت خالی ہاتھ لوٹ گئی تھی۔ ان کے گھر میں یا راہ چلتے کوئی بھی اس سے کچھ مانگتا تو یامین انتہائی حقارت سے اور بدتہذیبی سے ناشائستہ جملے ادا کر کے انہیں بھگا دیتا۔ یہ کوئی آج کی بات نہ تھی، بچپن سے ہی اس کی طبیعت میں سختی در آئی تھی۔ سبھی کہتے تھے کہ یامین نے سخت مزاج پایا ہے، اسے اپنے رویے میں تبدیلی لانی چاہیے۔ بلاوجہ ہر بات میں تلخی پیدا کر دینا یا تلخی سے جواب دینا اس کے مزاج میں رُج بس چکا تھا۔ اس کے امی ابو نے اسے کئی بار سمجھایا کہ بیٹا دروازے پر آئے کسی ضرورت مند کو دھتکارنا یا انہیں برا بھلا کہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ مفلوک الحال لوگ ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے

تو نرمی سے انکار کر دو مگر یامین تو انہیں دھرتی کا بوجھ سمجھتا تھا۔ وہ ہشتم جماعت میں تھا۔ سب کہتے کہ ان معصوموں کی دُعائیں لیا کرو مگر وہ تو دعا سے ہمیشہ دُور بھاگتا تھا۔ جب سب لوگ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے تو وہ ہمیشہ دعا مانگے بغیر مسجد سے اٹھ آتا تھا۔ امام مسجد جمعہ کی نماز میں درس دیتے ہوئے بتاتے کہ قرآن پاک اور بے شمار احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے دعا مانگنے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ ”تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ (سورۃ المؤمنون)۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون اور آسمان و زمین کا نور ہے۔ جس شخص نے دعا مانگی اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ مولانا صاحب بتاتے کہ ہمیں ہمیشہ یہ دعا مانگنی چاہیے کہ اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت مانگتا ہوں۔

یامین کی زندگی دعا کی نعمت سے خالی رہی۔ اس نے دعا کی مہربان چھتری میں پناہ لینے کی کوشش ہی نہ کی تھی، اسی وجہ سے اس

کی زندگی میں پیار اور محبت کی مٹھاس کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو ذہانت تو خوب ملی تھی مگر مزاج میں تندہی و ترشی تھی۔ تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے اس نے بی کام اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا اور جلد ہی اسے بینک میں ملازمت مل گئی۔ یہاں بھی اس کے مزاج میں گھلی تلخی ختم نہ ہوئی۔ ہر کسٹمر سے تلخ لہجے میں بات کرنا اس کا معمول تھا۔ وہ بینک مینجر سے اس کے رویے کی شکایت کرتے تھے۔ مینجر صاحب بہت رحم دل انسان تھے، اسے سمجھاتے کہ بیٹا ہم یہاں مخلوق کی خدمت کرنے کے لیے بیٹھے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے کہ لوگوں سے اچھا سلوک کرو۔ بیٹا! تم اس میدان میں بالکل نئے آئے ہو، لوگوں سے نرمی، شفقت اور پیار سے برتاؤ کرو، یہ لوگ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ انہیں دکھ مت دو مگر یامین کے مزاج میں اتنی حدت تھی کہ چھوٹی سی بات پر بھی بھڑک اٹھتا تھا، وہ مینجر کی بات خاموشی سے سن لیتا مگر پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ ذرا مزاج سے ہٹ کے بات سننے کو ملی تو فوراً خون ابال میں آ جاتا۔ اسے اس سلسلے میں مینجر نے بہ طور سزا بھاری جرمانہ بھی عائد کیا مگر یامین نے حسب عادت اپنی روش برقرار رکھی۔ یامین کی شادی جس سے ہوئی وہ بھی اسی کا پر تو تھی۔ روزانہ تو ٹکار، لڑائی جھگڑے تک نوبت آ جاتی۔ اس کو شادی شدہ زندگی میں بھی سکون اور چین نہ تھا۔ وقت کا پیہہ چلتا رہا اور یامین مینجر کے عہدے تک جا پہنچا۔ اس کے تیکھے رویے نے لوگوں کو اس سے بدظن اور دُور کر دیا تھا۔

احمد بخش بہت دنوں بعد شہر آیا تھا۔ شہر میں ہونے والی تبدیلی اور ترقی سے وہ بہت حیران ہوا تھا۔ اس نے بینک سے رقم نکالنے کے لیے اپنا اے ٹی ایم کارڈ مشین میں ڈالا تو اس کا کارڈ مشین میں ہی رہ گیا۔ وہ کارڈ لینے کے لیے بینک میں داخل ہوا۔ انتظار گاہ میں اس کی نگاہ ٹھہری گئی۔ اس کے گاؤں کے وہ لوگ جو کسی مجبوری یا اولاد کی خاطر شہر آ کر آباد ہوئے تھے، اس کے سامنے موجود تھے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے بھی احمد بخش کو دیکھا تو والہانہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور ایک دوسرے کے دکھ درد جانے۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا مگر یہ جگہ مناسب

نہ تھی۔ احمد بخش کو معلوم ہوا کہ یہ سب یہاں بینک سے قرض حسنہ لینے کے متمنی تھے مگر بینک مینجر ہر بار کوئی نہ کوئی نیا اعتراض لگا دیتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کا بینک مینجر بہت تلخ مزاج ہے، کسی کی بات ہی نہیں سنتا۔ آنے والے کو سب کے سامنے بلا عذر بے عزت کر کے رکھ دیتا ہے، تو ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں یہ کامران عرف کامی کا بیٹا یامین تو نہیں، تو اس نے اس کی تصدیق کی۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے اسے بہت سے حوالے بھی یاد کروائے ہیں مگر وہ تو کسی کو پہچاننے سے انکاری ہے۔ یہ سنتے ہی احمد بخش سیدھا مینجر کے کمرے میں گیا اور جاتے ہی ”میرا بیٹا یامین“ کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔

یامین دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ کہیں اس کا شاف دیکھ اور سن تو نہیں رہا۔ ”یامین تم بڑے تو ہو گئے مگر مزاج میں تلخی اور کڑواہٹ ابھی بھی باقی ہے۔ تم بڑے عہدے تک تو جا پہنچے ہو مگر اپنے اخلاق کو اچھا نہیں کیا۔ بیٹا! یہ جو باہر انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں یہ سب کے سب ہمارے اپنے ہیں۔ ہم سب ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہماری خوشیاں سانجھی ہیں، آج یہ سب شہر آ بے ہیں تو عارضی دُوری سہی مگر اپنائیت کا رشتہ تو ہے۔ تم نے ان سب کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ یہ سامنے جو نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہیں چاچا اختر، انہوں نے اپنی بیٹی کا بیاہ کرنا ہے، سفید پوش ہے بے چارہ۔ قرض لے کر بیٹی کا بیاہ کرنا چاہتا ہے اور ان کے ساتھ سفید سوٹ میں چاچا اکرم کو اپنی بیمار بیوی کا علاج معالجہ کرانا ہے اور ان کے ساتھ چاچا نور محمد نے اپنے بیٹے کا کالج میں داخلہ کروانا ہے۔ غرض ہر ایک کی اپنی اپنی ضرورتیں ہیں۔ یامین تم اس بڑی سیٹ پر بیٹھ کر بڑے بڑے صنعت کاروں، فیکٹری مالکان اور سیاسی لوگوں کو بغیر کسی عذر کے قرض حسنہ دے رہے ہو، انہوں نے کبھی تمہیں آج تک دُعا دی؟ وہ تمہیں صرف اپنا آلہ کار سمجھتے ہیں اور بس۔ اگر تم نہیں کرو گے تو وہ کسی اور سے کرا لیں گے۔ تمہیں کیا ملے گا، تم خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔ میرے بیٹے ان معصوموں کی دُعا لیں لو۔ قرض کے اصل حق دار تو یہ لوگ ہیں، ان کو قرض حسنہ دو اور دیکھو

ہو، ماتھے پہ بل ایسے گڑے ہوئے ہیں جیسے دریا کی لہریں۔ انہیں اپنی شفقت اور محبت سے مٹاؤ۔ اٹھو بیٹا! دیر مت کرو اور ان کی دُعاؤں لینے کا موقع ضائع مت کرو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور باہر جانے لگے تو یامین نے انہیں آواز دی۔ ”چچا جی، ٹھہریں! میں واقعی بہت سخت مزاج ہو گیا تھا، میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ میری زندگی میں خیر کیوں نہیں، دولت کی ریل پیل اور زندگی کی ہر آسائش ہونے کے باوجود بھی میری زندگی سکون کی نعمت سے خالی رہی۔ آج میں جان گیا کہ میں نے کبھی کسی کی دُعا لینے یا اللہ سے دُعا مانگنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، شاید انہی دُعاؤں



کی میری زندگی میں کمی رہ گئی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب اپنے ماتھے سے ان شکنوں کو محبت کی استری سے مٹا دوں گا۔“ یامین نے اسی وقت آپریشن مینجر شعیب کو بلایا۔ کچھ دیر بعد یامین نے وہ تمام فائلیں منگوائیں، جو قرض حسنہ کے لیے تھیں مگر اس نے ان پر کوئی نہ کوئی بلاوجہ اعتراضات لگا رکھے تھے، یامین نے ان تمام فائلوں سے اعتراض ہٹا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیے اور چچا احمد بخش سے والہانہ لپٹ گیا۔

یہ کیسے تمہارے لیے دُعاؤں کرتے ہیں۔ میرے بیٹے اس منصب پر بیٹھے ہو تو ان کی جائز ضروریات کو پورا کر کے ان کی دُعاؤں لو۔ بیٹا! تم نے اس بینک کی نوکری میں ہمیشہ دوسروں کے کھاتے کھولے ہیں، آج ایک ایسا کھاتہ کھولو جو تمہارے دنیا سے جانے کے بعد بھی آن لائن رہے۔ ایک حدیث مبارکہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے صدقہ جاریہ، نفع بخش علم اور صالح لوگ جو اس کے لیے دُعا کریں (صحیح مسلم)۔ بیٹا! آج تم دُعا کا کھاتہ کھول دو، پھر دیکھو تمہاری زندگی میں کیسے بہاریں آتی ہیں۔“

یامین سر جھکائے احمد بخش کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اندر سے اپنے رویے پر بہت ناؤم تھا۔ احمد بخش کی باتیں سیدھی اس کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ یہ سچ تھا کہ وہ ساری زندگی دُعا سے بھاگتا رہا تھا۔ اس کی زندگی میں دُعاؤں کی مہربان چھتری میں بہت سارے چھید ہو چکے تھے کہ کوئی لطیف سایہ اس پر اترتا ہی نہیں تھا، جنہیں آج احمد بخش بہت محبت اور سلیقے سے پُر کر رہا تھا۔

احمد بخش نے کہا۔ ”یامین کبھی تم نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے۔ تلخی اور کڑواہٹ سے چہرہ ایسے ہو گیا ہے جیسے شکن آلود کپڑا

آئندہ ماہ مئی 2013ء کے شمارے میں پڑھنا مت بھولے گا۔

چچا تیز گام نے سائیکل چلائی

روز روز ہونے والی سی این جی کی ہڑتالوں اور پٹرول کی قیمتوں میں ہونے والے اضافوں سے تنگ آ کر چچا تیز گام نے خریدی ہے ایک عدد سائیکل۔ انہوں نے کبھی زندگی میں سائیکل نہیں چلائی، لیکن بقول چچا تیز گام ”مانا کہ ہم نے کبھی سائیکل جیسی چھوٹی موٹی سواری نہیں چلائی، ہم جدی پشتی نواب ہیں۔ اس لیے ہمیشہ نوابانہ سواریاں موٹر سائیکل، جیپ، کار اور بس ہی چلائی ہے لیکن اب ہم اتنے بھی انارڈی نہیں کہ سائیکل جیسی چھوٹی سواری بھی نہ چلا سکیں۔“

اب جو چچا تیز گام نے سائیکل چلائی تو.....؟

ایک ہنستی مسکراتی اور چہرے پر مسکراہٹ کے پھول بکھیرنے والی کہانی



آئیے عہد کریں!

وقاص 15 سالہ نوعمر لڑکا تھا۔ وہ جماعت نہم کا طالب علم تھا۔ اتوار کے دن وہ اکثر اوقات اپنے دوستوں کے ساتھ سارا دن کھیل کود میں وقت گزارتا تھا۔ ایک دن وہ صبح سویرے اپنی موٹر سائیکل نکال کر گھر سے بغیر بتائے چلا گیا اور سارا دن گھر واپس نہ آیا۔ اس کے گھر والوں کو بڑی تشویش ہوئی۔ والدین نے اس کے دوست احباب سے بھی رابطہ کیا لیکن کہیں سے اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ آخر رات کو کسی نے اطلاع دی کہ ون ویلنگ کرتے ہوئے وقاص کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ میو اسپتال کے ایمرجنسی یونٹ میں زیر علاج ہے۔ اسے کافی چوٹیں آئی ہیں لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

وقاص کے والدین کو اس بات سے بڑی تشویش ہوئی لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس کی جان بچ گئی۔ بچو! زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے جس کی حفاظت ہمارا بنیادی فرض ہے۔ اسے بامقصد اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے سے گزار کر ہم دین و دنیا میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ ون ویلنگ کرنا خلاف قانون اور جرم ہے جس کی سخت سزا ہے۔ بچے اس بات کا عہد کریں کہ ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے آپ کی یا دوسروں کی جان و مال کا نقصان ہو اور قانون کی خلاف ورزی ہو۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں ان کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہد نامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔



ان بچوں نے عہد کیا ہے کہ وہ کسی کا مذاق نہیں اڑائیں گے۔

شاباش

ثوبان احمد، فاطمہ احمد، سومرہ۔ سلمان حیدر، کہروڑپکا۔ فاطمہ بٹ، لاہور۔ غیور محسن عباس ہاشمی، فیصل آباد۔ حسن رضا سردار، کاموٹی۔ ماہ رخ آمنہ، چیچہ وطنی۔ مامن فاطمہ، نور فاطمہ، محمد نعیم امین، لاہور۔ عبداللہ بن ثقلین، بہاول پور۔ کنز انوید الرحمن، لاہور۔ محمد آصف جمال، فائقہ نوید ملک، لاہور۔ شہریار اظہر، اسلام آباد۔ ہانیہ جمشید مروت، راول پنڈی۔ محمد زبیر عبداللہ، خانقاہ ڈوگراں۔ محمد عاطف ملک، حسن علی عتیق، لاہور۔ نزل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ جہانگیر انور گوجرانوالہ۔ نعمان صفدر، اٹک۔ کوثر ظہیر، لاہور۔ زائرہ زینب، ملتان۔ محمد اسامہ مشتاق، اوکاڑہ۔ شازم نصیر، فیصل آباد۔ صداقت علی، لاہور۔ سمیہ، ایبٹ آباد۔ عائشہ کریم، ملتان۔ کول حفیظ، راول پنڈی۔ وقار وکیل، دریا خان۔ فیصل فضل کریم، راول پنڈی۔ افراح اکبر، لاہور۔ سیف اللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد عمر شفقت، لاہور۔

اب ہنستی ہے پھر روئے گی، جب اوپر لے کر سوئے گی

کر کہنے لگا:

”اب ہنستی ہے پھر روئے گی، جب اوپر لے کر سوئے گی۔“
مگر اماں کنیز فضلہ بابا کا یہ اشارہ اس وقت سمجھ نہ پائی اور چوہیا کے تماشے سے محظوظ ہوتی ہوئی لحاف لے کر گھر واپس آ گئی۔
آتے ہی لحاف بچھا کر اس میں ڈورے ڈالے اور رات کو مزے سے اوڑھ کر سوئی۔

چند دن بعد ہی بارش ہوئی، اولے پڑے اور ایک دم سردی بڑھ گئی۔ اس رات کو اماں کنیز کو وہ لحاف بہت ہلکا محسوس ہوا۔ اُس میں سردی رُک نہیں رہی تھی اور بے چاری اماں کنیز ٹھٹھر رہی تھی۔ سردی کے مارے اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ کوفت کے مارے روہانسی ہو رہی تھی۔ اب اسے یاد آیا کہ فضلہ بابا سچ ہی کہہ رہا تھا کہ اب ہنستی ہے پھر روئے گی، جب اوپر لے کر سوئے گی۔

اس وقت تو اماں کنیز کو چوہیا کا وہ شغل بہت اچھا لگا تھا، مگر اس کے نتیجے میں اب وہ تکلیف اٹھا رہی تھی۔ جب کسی دل پسند مشغلے کا بُرا انجام بھگتنا پڑے تو یہ مثل صادق آتی ہے۔

☆☆☆

اماں کنیز سر پر گٹھری اٹھائے دھنیے کی دکان پر پہنچی اور بڑی منت سے بولی: ”فضلہ بھائی! میرا یہ لحاف ابھی میرے کھڑے کھڑے بھر دو، ایک دم سردی پڑنے لگی ہے اور میرے پاس اوپر لینے کو لحاف نہیں ہے۔“

فضلہ بابا کے پاس ویسے بھی اس وقت کوئی کام نہ تھا۔ اس نے اماں کنیز سے گٹھری پکڑ لی اور بوریا بچھا کر روئی دھنکنے لگا۔ لحاف کا پرانا ”لوگر“ دھنیے کی ”دھن دھن دھنک دھوں“ کی آواز کے ساتھ ساتھ نرم ہو کر برف کے سفید گالوں کی طرح اڑنے لگا۔

اتنے میں اماں کنیز نے دیکھا کہ فضلہ بابا کی دکان کی ایک بغلی کوٹھڑی سے ننھی سی ایک چوہیا نکلی اور اپنی جسامت سے بیس گنا بڑا روئی کا گالا پنچوں میں دبا کر کوٹھڑی میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئی اور بڑا سا روئی کا گالا لے کر بھاگ گئی۔ اس طرح چوہیا نے تانتا باندھ لیا، آتی اور گالا اٹھا کر لے جاتی۔

اماں کنیز کو یہ منظر بڑا دلچسپ معلوم ہوا کہ جیسے روئی کا گالا اپنے آپ چل کر جا رہا ہو۔ وہ ننھی چوہیا کا یہ دلچسپ کرتب دیکھ دیکھ کر ہنستی جاتی تھی۔ فضلہ بابا اُسے یوں ہنستے اور خوش ہوتے دیکھ

10۔ کس عظیم سپہ سالار نے اسکندریہ فتح کیا تھا؟

۱۔ طارق بن زیاد ۲۔ خالد بن ولید ۳۔ عمرو بن العاص

جوابات علمی آزمائش مارچ 2013ء

1۔ تقریباً ایک سال 2۔ ہرن کوٹ 3۔ اسرار خودی 4۔ عبدالکریم چھاگلہ 5۔ میثاق لکھنؤ 6۔ 1934ء 7۔ 7 اگست 1947ء 8۔ شدمی تحریک 9۔ دسمبر 1930ء 10۔ دلہ بھائی ٹیل۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ کوئل صادق چوہدری، گوجرانوالہ (150 روپے کی کتب)

☆ پاکیزہ حسین، حیدر آباد (100 روپے کی کتب)

☆ نبیلہ اسلم، میرپور، آزاد کشمیر (90 روپے کی کتب)

”دماغ لڑاؤ“ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

محمد زبیر عبید اللہ، خانقاہ ڈوگرال۔ طہ یاسین، حیدر آباد۔ محمد حامد رضا

قادری، کامونکی۔ ارینا آفتاب، کراچی۔ بشری صفدر، تلہ گنگ۔ سیدہ

جویریہ شاہ، واہ کینٹ۔ عبدالواسط خان خٹک، نوشہرہ۔ عبداللہ مغل، ٹوبہ

ٹیک سنگھ۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ محمد عتیق الرحمن اسلم، میرپور آزاد

کشمیر۔ سید طاہر اسلم ہاشمی، قصور۔ سدرہ ستار، صوابی۔ عمیر فاطمہ، لاہور

کینٹ۔ ہانیہ جمشید مروت، راول پنڈی۔ محمد فریاد علی قادری، کامونکی۔

حفصہ اعجاز، صوابی۔ حسنین احمد فضل، میرپور آزاد کشمیر۔ محمد محسن علی

قادری، کامونکی۔ رانا محمد منیب احمد، ملتان۔ حسن رضا سردار، کامونکی۔

ولید اشرف، گوجرہ۔ محمد زبیر مقصود، لاہور۔ مظہر عباس صدیقی، خانیوال۔

سامعہ خالد، شکر گڑھ۔ حسن علی عتیق، لاہور۔ حبیب الرحمن غنی، ڈیرہ

اسماعیل خان۔ عبید اللہ احمد، پشاور۔ ساجدہ وحید، اسلام آباد۔ عزیز کریم،

میرپور آزاد کشمیر۔ محمد اسد علی خان، ساہیوال۔ سعد علی، سرگودھا۔ بلال

احمد، حسن ابدال۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ ہادیہ فرقان، معظّمہ عرفان،

لاہور۔ حیدر امام ڈار، ڈسکہ۔ انصر علی، وہاڑی۔ محمد زوہیب، کراچی۔

اریحہ سرفراز، لالہ موسیٰ۔ فائقہ نوید ملک، لاہور۔ عمارہ علی ججہ، لاہور۔

سلمان حیدر کھنڈ، لودھراں۔ غیور محسن عباس ہاشمی، فیصل آباد۔ محمد نافع،

لاہور۔ رومیثہ مختار، فیصل آباد۔ فرحت اللہ، کوہاٹ۔ ایمان طارق،

راول پنڈی۔ ربیعہ فاطمہ، چکوال۔ سہل سوہیل، اسلام آباد۔ حسین اسلم

گورانیہ، گوجرانوالہ۔ ہمایوں طارق، ملتان۔ آصفہ عطاریہ، شکر گڑھ۔

حصہ اول

داؤدی علمی آزمائش

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ علم حیاتیات کا بانی کسے کہا جاتا ہے؟

۱۔ سقراط ۲۔ ارسطو ۳۔ بقراط

2۔ اسپرین نامی دوا کس چیز سے حاصل کی جاتی ہے؟

۱۔ درختوں سے ۲۔ جڑی بوٹیوں سے ۳۔ کوئلار سے

3۔ اسلامی سلطنت کا پہلا دارالحکومت ہونے کا شرف کس شہر کو حاصل ہوا؟

۱۔ مکہ معظمہ ۲۔ طائف ۳۔ مدینہ النبی

4۔ حضرت داؤد کے ہاتھ میں کون سی دھات نرم ہو جایا کرتی تھی؟

۱۔ تانبا ۲۔ لوہا ۳۔ چاندی

5۔ غزوہ بدر میں کل کتنے صحابہ شہید ہوئے؟

۱۔ بارہ ۲۔ تیرہ ۳۔ چودہ

6۔ نماز جنازہ میں کتنی تکبیریں ہوتی ہیں؟

۱۔ تین تکبیریں ۲۔ چار تکبیریں ۳۔ ایک تکبیر

7۔ حج کے دوران یوم النحر کس دن کو کہا جاتا ہے؟

۱۔ احرام باندھنا ۲۔ قربانی کرنا ۳۔ عرفات میں ٹھہرنا

8۔ علامہ اقبال کا پہلا اردو مجموعہ کلام ”بانگ درا“ کا کیا مطلب ہے؟

۱۔ گھنٹی کی آواز ۲۔ پانی کی آواز ۳۔ بارش کی آواز

9۔ علامہ اقبال کی نظم ”مرزا غالب“ ان کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟

۱۔ بال جبریل ۲۔ بانگ درا ۳۔ ضرب کلیم



یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





انتہائی پرکشش اور سسپنس بھرے جملے لکھے ہوئے تھے۔

”رسوں پر سائیکل چلتے ہوئے دیکھئے۔ جی ہاں..... رسوں پر۔“
 ”موت کے کنویں میں ایک موٹر سائیکل سوار کو موٹر سائیکل چلاتے ہوئے تو آپ نے دیکھا ہوگا لیکن کبھی دو آدمیوں کو یہ کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ نہیں..... نا! تو آئیے..... اور اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے یہ منظر دیکھئے۔“ ”جنگل کے بے تاج بادشاہ سلامت شیر سے راجو کا خون خوار اور حیرت انگیز مقابلہ..... ایک ایسا شو جسے دیکھ کر مارے حیرت کے آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔“ ان جملوں نے لوگوں کو شہر سے باہر میدان کی طرف رخ کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔

سرکس کی یہ خبریں اڑتی اڑتی چچا تیز گام تک بھی پہنچی تھیں لیکن انہوں نے بالکل بھی ان پر کان نہیں دھرے تھے کیوں کہ وہ اس قسم کے پروگراموں میں کم ہی جایا کرتے تھے۔ کل وہ اپنے معمول کے مطابق عصر کی نماز کے بعد گلو میاں کی طرف جا رہے تھے کہ گلو میاں اور پہلوان جی، شہراتی کی دکان پر بیٹھے نظر آئے۔ تینوں سر جوڑے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

”ارے بھئی! یہ اکیلے اکیلے کیا کانا پھوسی ہو رہی ہے۔“ چچا

”یار.....! ایک تو اس تیز گام کی سمجھ نہیں آتی۔ کچھ اور نہ سوچھی تو غائب ہی ہو گئے۔“ پہلوان جی اپنی توند کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے بولے۔ یہ ان کی خاص عادت تھی۔ جب بھی ان پر جھنجھلاہٹ طاری ہوتی تو وہ اپنی حد سے زیادہ باہر نکلی ہوئی توند کو ڈھول کی طرح بجانے لگتے۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تیز گام کو رہنے دو۔ یہ ہمارا بھی مزار خراب کرے گا۔“ شہراتی حلوائی بولا۔

”پہلوان جی کو ہی شوق تھا ان کو لانے کا، بڑے چاؤ سے کہہ رہے تھے تیز گام کو ساتھ لے چلتے ہیں۔ ذرا مزار ہے گا۔“ گلو میاں نے برا سا منہ بنا کر پہلوان جی کی طرف دیکھا جب کہ پہلوان جی کی نظریں لوگوں کے ہجوم میں چچا تیز گام کو تلاش کر رہی تھیں۔ چچا تیز گام کا دور، دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ لوگوں کے اس اژدھام میں ان کو تلاش کرنا سمندر میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ لوگ تھے کہ شہر سے باہر میدان میں لگی ”لکی ایرانی سرکس“ دیکھنے دوڑے چلے آ رہے تھے، جس کی چند دن سے شہر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ شہر کی تمام مشہور شاہ راہوں پر دلکش اشتہاری بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر



تیز گام جھٹ سے ان کے سر پر پہنچ گئے۔

”لو بھئی! تیز گام بھی آ گئے..... ہم تیز گام کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے۔“ پہلوان جی ان کو دیکھتے ہی بولے۔

”پہلے یہ تو پتا چلے کہ جانا کہاں ہے؟“ چچا تیز گام نے حیرت سے پوچھا۔

”یار.....! ہم لوگوں نے سرکس دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تقریباً سارا شہر دیکھ چکا ہے۔ ہم ہی رہ گئے ہیں۔“ پہلوان جی بولے۔

”لو بھلا سرکس بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔“ چچا تیز گام برا سامنہ بنا کر بولے۔

”سارا شہر سرکس کے شوز کا دیوانہ ہو چکا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ سرکس بھی بھلا کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔ تم نے کبھی دیکھی نہیں، اس لیے کہہ رہے ہو۔“ شہزادی حلوائی بولا۔

”ارے بھئی! اگر تیز گام ہمارے ساتھ نہیں چلنا چاہتے تو کیوں مجبور کرتے ہو؟“ گلو میاں جھٹ سے بولے۔ ان کو پچھلے سال کی بات یاد آ گئی تھی جب وہ دین پور کے میلے میں غلطی سے چچا تیز گام کو فالودہ کھانے کی دعوت دے بیٹھے تھے اور پھر ان کو سات پیالوں کا بل بھرنا پڑا تھا۔

”ہاہا..... پہلوان جی..... تم نے کیا کہا؟ ہم نے کبھی سرکس نہیں دیکھی.....“

”ارے میاں.....! ہمارے ابا حضور نواب فخر الدین فخری تو سرکس کے بے حد دلدادہ تھے۔ وہ ہر سال اپنی ریاست میں سرکس کا شو کروایا کرتے تھے اور تم کہتے ہو کہ ہمیں کیا معلوم سرکس کیا ہوتی ہے۔ کل ہم بھی ضرور تمہارے ساتھ سرکس دیکھنے جائیں گے۔“ چچا تیز گام کو کوئی لاطعلمی کا طعنہ دے، یہ بات بھلا وہ کہاں برداشت کرتے تھے۔ لہذا فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے سرکس پہ جانے کا سن کر بیگم بھڑک اٹھیں لیکن انہوں نے چچا تیز گام کو کچھ بھی نہیں کہا، کیوں کہ ان کو معلوم تھا چچا تیز گام جب کسی بات کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر اسے کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ دوپہر کو ظہر کی

نماز کے بعد وہ چاروں شہر سے باہر میدان میں موجود تھے۔ سرکس کا پنڈال میدان کے وسط میں لگا ہوا تھا لیکن پورا میدان لوگوں سے کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ٹکٹ لینے کے لیے ایک لمبی سی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھی قطار میں لگ گئے۔ سب سے آگے پہلوان جی تھے۔ کافی دیر بعد ان کی باری آئی۔ ٹکٹ لے کر انہوں نے جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو چچا تیز گام غائب تھے۔

”دیوانو.....! متانو.....! شو شروع ہونے میں صرف چند منٹ رہ گئے ہیں۔ جلدی جلدی آ جاؤ..... اور اپنی زندگی کا سب سے حیرت انگیز، خطرناک اور دل چسپ و عجیب شو دیکھئے۔“ کاؤنٹر پر بیٹھا جو کر نما آدمی لاؤڈ سپیکر کا مائیک ہاتھ میں پکڑ کر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”تیز گام کا تو دور دور تک پتا نہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ ہمارا شو بھی نکل جائے۔ ٹکٹ بھی ہم لے چکے ہیں۔ آؤ ہم لوگ پنڈال کے اندر چلتے ہیں۔ تیز گام خود آتا رہے گا۔“ گلو میاں تنگ آ کر بولے۔ پہلوان جی اور شہزادی حلوائی کو بھی گلو میاں کی تجویز ہی بہتر لگی اور وہ تینوں پنڈال کے اندر داخل ہو گئے۔

”آپ لوگ وہ سامنے چلے جائیں۔ وہاں موت کا کنواں ہے۔ سب سے پہلے آپ کو موت کے کنویں کا ایک خطرناک شو دکھایا جائے گا۔“ استقبالیہ پر موجود شخص ان کی رہنمائی کرتے ہوئے بولا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے موت کے کنویں کی منڈیر پر پہنچے۔

منڈیر پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شو شروع ہو گیا۔ جیسے ہی ان کی نظر موٹر سائیکل سوار کے پیچھے بیٹھے شخص پر پڑی ان کو حیرت و تعجب کا شدید جھٹکا لگا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو زور زور سے ملا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن منظر جوں کا توں تھا۔

چچا تیز گام کو یوں قطار میں لگ کر ٹکٹ ملنے کا انتظار کرتے ہوئے سخت کوفت ہو رہی تھی کیوں کہ انتظار اور صبر کا تو ان میں مادہ ہی نہ تھا۔ وہ تو ہر کام جلدی جلدی اور تیز تیز کرنے کے عادی تھے۔ تنگ آ کر وہ قطار سے نکل کر ٹکٹ لینے کے لیے آگے بڑھے۔ رش بے حد زیادہ تھا۔ اس لیے ان کے ساتھی ان کو یوں قطار سے نکلتے نہ دیکھ سکے۔

”اے بڑے میاں.....! کہاں گھسے چلے آ رہے ہو..... جاؤ جا کر قطار میں لگو..... بغیر قطار کے ٹکٹ نہیں ملے گا۔“ ٹکٹ کیپر کے ساتھ کھڑے ہوئے بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے جو تیز گام کو گھورا تو وہ وہاں سے دم دبا کر بھاگے۔ اب جو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کی سٹی گم ہو گئی۔ یہ بات تو انہیں یاد ہی نہیں رہی تھی کہ ان کے ساتھی قطار میں کہاں کھڑے ہیں کیوں کہ قطار بے حد لمبی تھی اور دھیرے دھیرے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ چچا تیز گام نے قطار کے گرد ایک چکر لگایا لیکن گلو میاں، پہلوان جی اور شبراتی حلوائی انہیں کہیں بھی نظر نہیں آئے۔

”وہ لوگ ضرور ٹکٹ لے کر پنڈال میں داخل ہو گئے ہوں گے اور اندر جا کر ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ چچا تیز گام نے سوچا اور پنڈال میں داخل ہونے کے لیے اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ دروازے سے تو ٹکٹ کے بغیر داخلہ ناممکن تھا، اس لیے انہوں نے پنڈال میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ پنڈال کے عقب میں انہیں خیمے لگے نظر آئے۔ انہوں نے سوچا ضرور یہاں سے اندر داخل ہونے کا راستہ ہو گا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جھٹ سے خیمے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں لیپ کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک ایک تیز آواز سنائی دی۔

”ارے راجو.....!“ چچا تیز گام نے چونک کر خیمے کے اندر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ایک جوکر نما شخص اسے گھور رہا تھا۔ ”کہاں چلا گیا تھا تو..... کرتب شروع ہونے والا ہے اور تجھے فکر ہی نہیں ہے۔ چل جلدی سے یہ جیکٹ پہن کر میرے پیچھے آ جا۔“ یہ کہہ کر اس آدمی نے ایک بوسیدہ سی سرخ جیکٹ چچا تیز گام کی طرف اچھال دی۔ انہوں نے حیرت سے جیکٹ کی طرف دیکھا۔ ایسی جیکٹ عموماً کرتب دکھانے والے پہنتے تھے۔

”دل..... لیکن..... مم..... میں راجو نہیں ہوں۔“ چچا تیز گام گھبرا کر بولے۔

”کیا کہا.....! تو راجو نہیں ہے.....؟ دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا..... ٹھیک ہے آج سائیکل کا کرتب دکھاتے ہوئے تمہارے سر پر چوٹ آئی ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ تمہاری یادداشت ہی چلی جائے۔ چل جلدی سے جیکٹ پہن، ورنہ استاد نے ایک گھونسا رسید کیا تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔“ اس آدمی نے زبردستی جیکٹ چچا تیز گام کو پہناتے ہوئے کہا۔

”کاشی! دیر مت کرو۔“ اچانک ایک کالے رنگ کا پہلوان نما آدمی خیمے کے دروازے پر نمودار ہوا۔

”بب..... بس استاد! ہم آ گئے۔“ اس کی گرج دار آواز سن کر کاشی کانپ کر رہ گیا۔ چچا تیز گام کو بھی اس کی آواز سن کر اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے، جلدی کرو..... سب تماشاخی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ خوف ناک سا آدمی دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

”دیکھا.....! اب بتاؤ میرے ساتھ چلتے ہو یا بلاؤں استاد کو؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے چچا تیز گام کی طرف دیکھا۔

”نن..... نہیں..... مم..... میں چلوں گا۔“ چچا تیز گام خوف سے کانپتے ہوئے بولے۔

”یہ ہوئی نا بات! تم کیوں ڈر رہے ہو؟ تمہیں تو بس میرے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھنا ہے۔ موٹر سائیکل تو میں چلاؤں گا۔“ وہ آدمی بولا اور چچا تیز گام کو اپنے ساتھ لیے ہوئے خیمے کے دوسرے

حلق میں آ گیا تھا۔ آج انہیں اپنی موت یقینی محسوس ہو رہی تھی۔ جب کاشی نے موٹر سائیکل ایک پیسے پر چلانا شروع کی تو چچا تیز گام کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

”ارے..... بچاؤ.....!!!“ ان کے منہ سے خوف ناک چیخیں نکلنے لگیں اور انہوں نے زور زور سے اپنے ہاتھ پاؤں ہوا میں مارنا شروع کر دیے۔ جیسے جیسے چچا تیز گام کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، تماشائیوں کی تالیوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ وہ ان کے ہاتھ پاؤں مارنے کو بھی کرتب ہی کا حصہ سمجھتے ہوئے مظلوظ ہو رہے تھے جب کہ تماشائیوں میں موجود پہلوان جی، اور گلو میاں حیرت و تعجب سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کو باہر تلاش کر رہے تھے اور یہ یہاں سرکس کا کرتب دکھا رہے تھے۔ ادھر چچا تیز گام خوف کی وجہ سے بے ہوش ہونے والے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے کرتب ختم ہوا۔ کاشی نے دھیرے دھیرے موٹر سائیکل کو روکنا شروع کیا۔ تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہوئے کرتب کو سراہ رہے تھے۔ پھر کاشی نے موٹر سائیکل کنویں کی دیواروں سے نیچے اتار لی اور دروازہ کھول کر موٹر سائیکل اندر لے آیا۔

”یار راجو! آج تو تم نے کمال کر دیا۔ اسی طرح دھیرے دھیرے تم سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔ بات ہے صرف ڈر کی۔ اگر تمہارا ڈر ختم ہو گیا تو سمجھو بات بن گئی۔ اب بس تمہارا صرف ایک کرتب رہ گیا ہے۔ وہی شیر کے ساتھ مقابلے والا۔“

”شش..... شیر کے ساتھ۔“ یہ سن کر تو چچا تیز گام کی جان ہی نکل گئی۔

”نن..... نہیں..... مم..... میں راجو نہیں ہوں۔“ انہوں نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن کاشی نے لپک کر انہیں پکڑ لیا۔

”یار بس! یہ آخری کرتب ہے۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی۔ یاد ہے نا مقابلہ کس طرح کرنا ہے؟ اسی طرح جیسے تم نے پچھلی مرتبہ کیا تھا۔ اگر تم ٹھیک سے مقابلہ کرو گے تو شیر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ کاشی ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے

دروازے سے باہر آ گیا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے، لائٹوں کی تیز روشنی سے چچا تیز گام کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کاشی نے جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھا لیا۔ جب تک چچا تیز گام کچھ دیکھنے کے قابل ہوئے، کاشی نے دھیرے دھیرے موٹر سائیکل چلانا شروع کر دی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مارے خوف کے ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ ان کو اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے محسوس ہوئے۔ وہ لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا بہت بڑا موت کا کنواں تھا۔ کنویں کے منڈیر پر چاروں طرف تماشائی کھڑے بڑے ہی جوش و خروش سے ان کو دیکھ رہے تھے۔

”ناظرین! انتظار کی گھڑیاں ختم..... اب سے چند لمحوں بعد آپ اپنی زندگی کا سب سے خطرناک کرتب دیکھیں گے۔ دونو جوان اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔“

”ارے..... یہ کیا؟“ جیسے ہی استاد کی نظر چچا تیز گام پر پڑی، وہ چونک اٹھا اور مائیک رکھ کر تیزی سے ان کی طرف لپکا لیکن استاد کے پہنچنے تک موت کے کنویں کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور کاشی موٹر سائیکل کی رفتار دھیرے دھیرے بڑھا رہا تھا۔ مارے خوف کے چچا تیز گام کی گھگھکی بندھ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ موٹر سائیکل کے ساتھ چچا تیز گام کو اپنا سر بھی گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مارے خوف کے ان کا دل اچھل کر



پکڑے، نہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا جب کہ چچا تیز گام شیر کے تصور ہی سے کانپ رہے تھے۔ اچانک وہی خوف ناک سا کالا آدمی خیمے میں داخل ہوا جسے کاشی استاد کہہ رہا تھا۔

”اے کاشی کے بچے! یہ کون ہے؟“ اس نے گرج دار آواز میں کہا۔

”یہ..... یہ..... راجو ہے استاد! وہی جسے آپ چند دن پہلے ہی لائے ہیں۔“ کاشی بولا۔

”مجھے اُلو بناتے ہو..... یہ دیکھو..... تمہاری آنکھیں ہیں کہ سچ بٹن..... یہ تمہیں راجو نظر آتا ہے۔“ یہ کہہ کر استاد نے جیب سے نارچ نکال کر لائٹ کا رخ چچا تیز گام کے چہرے کی طرف کر دیا۔

”ارے..... یہ تو واقعی راجو نہیں ہے۔“ چچا تیز گام کے چہرے کو روشنی میں دیکھتے ہی کاشی اچھل پڑا۔

”تو پھر یہ کون ہے.....؟“

”پپ..... پتا نہیں..... استاد! جب آپ نے مجھے راجو کو بلانے کے لیے بھیجا تھا تو یہ یہاں کھڑا تھا۔ خیمے کا بلب بھی اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے لائٹیں کی روشنی میں میں نے سمجھا یہ راجو ہے۔“ کاشی جلدی جلدی بولا۔

”کیوں ابے کون ہے تو.....؟“ استاد چچا تیز گام کو اپنی گول گول سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”ہم..... ہم..... تہ..... تیز..... اوہ نہیں۔ ہم تو اب تنویر احمد ہیں۔“ چچا تیز گام ذرا ڈرے اور پھر اپنی رہی سہی ہمت جمع کر کے بارعب لہجے میں بولے۔

”اوہ..... نواب صاحب..... سائیں..... ہمیں معاف کر دو..... ہم سے غلطی ہو گئی۔“ استاد اور کاشی لگے معافیاں مانگنے، وہ چچا تیز گام کو سچ مچ کا نواب سمجھ بیٹھے تھے۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... لیکن تم توبہ کرو کہ آئندہ کبھی کسی کے ساتھ ایسا نہیں کرو گے۔“ چچا تیز گام ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”سائیں ہمارے باپ داداؤں کی توبہ۔“ وہ دونوں گڑگڑاتے ہوئے بولے۔

”اے..... ہے..... ان بے چاروں نے کیا کیا ہے جو وہ توبہ

کریں۔ تم خود توبہ کرو۔“ چچا تیز گام گرج کر بولے۔

”اوہ..... ہماری توبہ۔“ وہ باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔

”ہاں! یہ ٹھیک ہے۔“ چچا تیز گام بولے اور اک شان بے نیازی سے چلتے ہوئے خیمے سے باہر نکلے۔ اچانک ان کو یاد آیا وہ تو یہاں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں آئے تھے، وہ تیزی سے پنڈال کے دروازے کی طرف بڑھے۔ گلو میاں، پہلوان جی اور شہزادی حلوائی پنڈال سے نکل رہے تھے۔

”ارے..... میاں تیز گام! آج تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ پہلے تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہیں سرکس کا فن بھی آتا ہے۔“ پہلوان جی ان کو دیکھتے ہی بولے۔

”ہاں بھی واقعی..... اپنے تیز گام تو چھپے رستم نکلے۔“ شہزادی نے جملہ کسا۔

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں..... ہم نے اس سے بھی بڑے بڑے کرتب دکھائے ہیں۔ اس زمانے میں ہمارے کرتبوں کی بڑی دھوم تھی۔“ چچا تیز گام اکڑ کر بولے۔

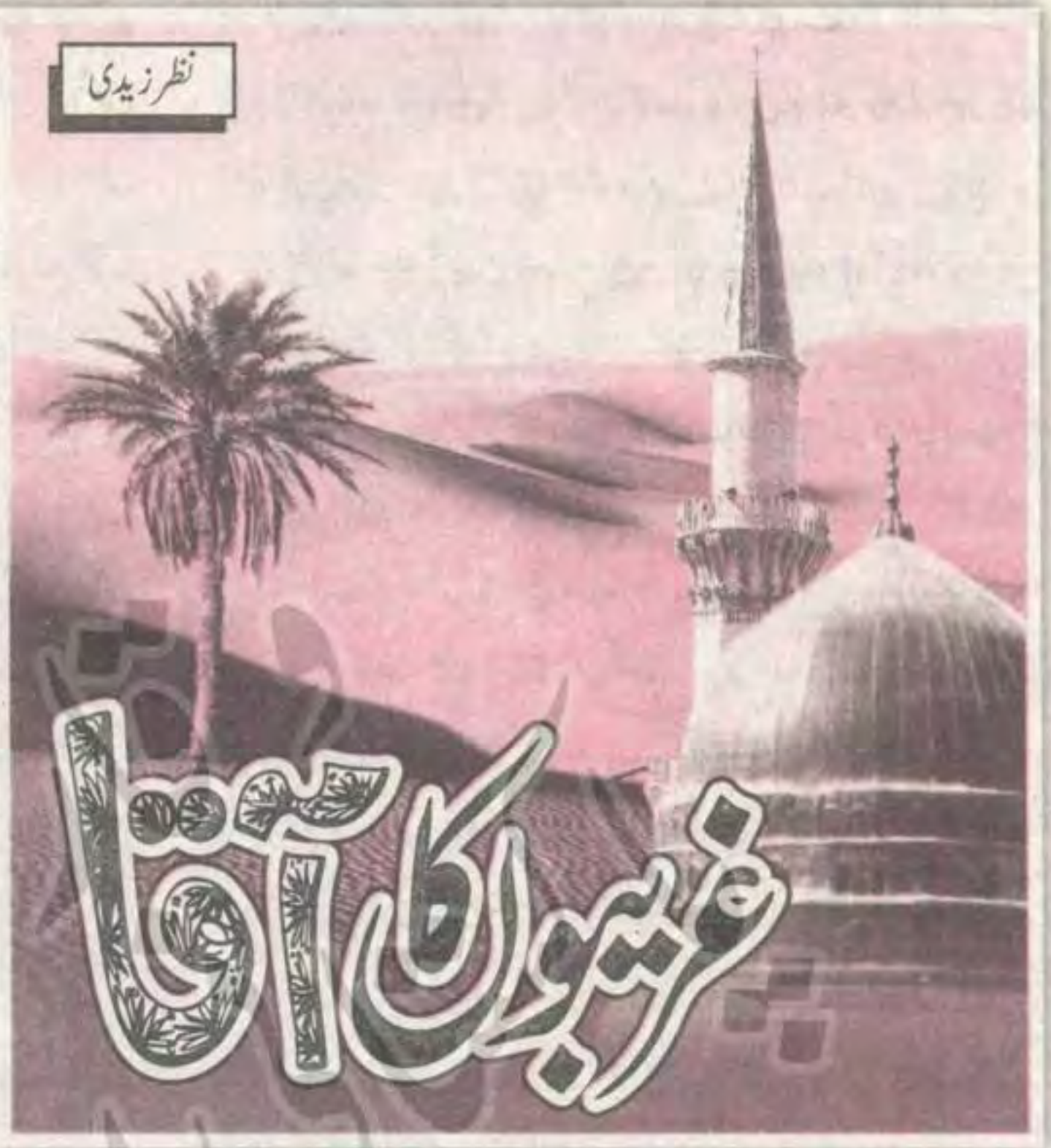
”سچ بتاؤ..... تیز گام! یہ تم نے کہاں سے سیکھا..... کیا جوانی میں تم سرکس میں کام کرتے تھے؟“ گلو میاں نے پوچھا۔

”ارے نہیں..... بس جب وہ ہمارے ابا جان نواب فخر الدین فخری سرکس کروایا کرتے تھے تو کبھی کبھی ہم بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر لیا کرتے تھے۔“ چچا تیز گام بولے۔ اسی وقت لاؤڈ سپیکر پر اعلان ابھرا۔ ”ناظرین! شہر سے خون خوار مقابلے کا شو شروع ہونے والا ہے۔ دیر نہ کیجیے، جلدی سے ٹکٹ کٹائیے..... اور دیکھئے اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے..... ایک خوف ناک منظر۔“

”آؤ یار..... یہ شو بھی دیکھتے ہیں۔“ گلو میاں بولے اور وہ سب ٹکٹ لینے کے لیے آگے بڑھے۔

”اف خدایا! اگر استاد مجھے نہ پہچانتا تو اس وقت میں شہر سے..... یہ سوچ کر ہی چچا تیز گام کو خوف سے جھرجھری آگئی لیکن پھر انہوں نے خود پہ قابو پایا اور بڑے جوش و خروش سے شیر کا مقابلہ دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔

☆☆☆



غریبوں کا آقا

مجھے اس وقت یہ خیال آ گیا کہ میں تو پردیسی ہوں۔ یہاں میرا تو کوئی خاندان ہی نہیں جس کے لوگوں کے ساتھ مل کر میں خندق کھودوں۔“

حضرت رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کی یہ بات سنی تو انہیں تسلی دی اور پھر اونچی آواز میں فرمایا: ”لوگو! غور سے سنو! آج سے سلمانؓ میرے خاندان کے آدمی ہیں۔ میں نے انہیں اپنے خاندان میں شامل کر لیا ہے۔“ اور پھر اس وقت سے حضرت سلمانؓ حضرت رسول اللہ ﷺ کے خاندان کے آدمی سمجھے جانے لگے۔ یہ بات آپ جانتے ہیں کہ ہمارے حضورؐ کا خاندان، بنی ہاشم، پورے عرب میں سب سے زیادہ عزت والا مانا جاتا تھا بلکہ عرب کے باہر بھی اس خاندان کی ایسی عزت تھی کہ جب اس خاندان کے لوگ تجارت کا سامان لے کر روم اور شام جاتے تھے تو ان سے محصول نہ لیا جاتا تھا۔

پیارے بچو! اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ نبیوں کے سردار اور ہمارے آقاؐ نے حضرت سلمانؓ کو اپنے خاندان میں شامل کر کے ان کی کیسی شان بڑھائی۔ غریبوں کے ایسے غم خوار تھے ہمارے حضورؐ۔

یہودی کی شرارت

ایک بار ایک یہودی حضرت رسول اللہ ﷺ کا مہمان بنا۔ حضورؐ کا قاعدہ تھا کہ اپنے مہمانوں کو اپنے گھر ٹھہراتے تھے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام خود کرتے تھے۔

اس یہودی کو بھی ہمارے حضورؐ نے اپنے گھر میں ہی ٹھہرایا، اسے اچھا کھانا کھلایا اور سونے کے لیے صاف ستھرا بستر دیا۔

یہودی ہمیشہ سے مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں۔ یہ یہودی بھی حضورؐ کو ستانے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ اسے رات کا کھانا کھلا کر حضورؐ اپنے حجرے میں تشریف لے گئے تو اس نے بستر پر پیشاب اور پاخانہ کیا اور صبح ہونے سے پہلے بھاگ گیا۔

صبح ہونے پر حضور ﷺ مہمان کا حال پوچھنے تشریف لائے تو یہودی کی شرارت کا حال معلوم ہوا۔ آپؐ چاہتے تو سوار بھیج کر اس

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب مکہ اور آس پاس کے کافروں نے مکہ کے مدینے پر چڑھائی کی تھی اور مدینے کے مسلمان دشمنوں کے حملے سے شہر کو بچانے کے لیے ایک بڑی سی خندق کھود رہے تھے۔ یہ کام بہت جلد پورا کرنا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ہر خاندان کے مردوں کی گنتی کے مطابق زمین ناپ کر دے دی تھی اور فرمایا تھا کہ اتنی دُور تک تم خندق کھودو گے۔ یہ طریقہ بہت ہی اچھا تھا۔ ہر خاندان والے اپنے حصے کی زمین میں بڑی ہمت اور محنت سے خندق کھود رہے تھے۔ خود حضرت رسول اللہ ﷺ بھی اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ خندق کھود رہے تھے۔

خندق کھودتے کھودتے حضورؐ نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ حضرت سلمان فارسیؓ ایک طرف اداس کھڑے ہیں۔ فارس ملک ایران کا پرانا نام ہے۔ یہ صحابی یعنی حضرت سلمان فارسیؓ ایران کے رہنے والے تھے اور اس وجہ سے انہیں سلمان فارسیؓ کہا جاتا ہے۔

حضورؐ نے انہیں اداس دیکھا تو فرمایا: ”سلمانؓ! کیا بات ہے؟ تم یوں اداس کیوں کھڑے ہو؟“ حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر حضرت سلمان فارسیؓ نے غم بھری آواز میں جواب دیا۔ ”یا رسول اللہ!

تو وہ سیدھا حضورؐ کے گھر آیا اور بہت بدتمیزی سے رقم ادا کرنے کا تقاضا کرنے لگا۔ اس نے حضورؐ کے بزرگوں کی شان تک میں گستاخی کی۔

اتفاق سے اس وقت اللہ کے پیارے نبیؐ کے ایک پیارے صحابی حضرت عمرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ یہودی نے ایسی گستاخی کی تو حضرت عمرؓ نے تلوار نیام سے نکال لی اور یہودی کو سزا دینے کا ارادہ کیا لیکن حضورؐ نے انہیں روک دیا اور فرمایا:

”اے عمر! اس یہودی سے صرف یہی کہنا کافی ہے کہ قرض ادا کرنے کا تقاضا اچھے الفاظ میں کرنا چاہیے اور اے عمر! مجھ سے یہ کہو کہ قرض وقت پر ادا کرنا چاہیے۔“

اچھے بچو! یہ واقعہ پڑھتے ہوئے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہودی نے سخت بدتمیزی کی تھی اور وہ اس بات کا حق دار تھا کہ اسے سخت سزا دی جاتی لیکن ہمارے حضورؐ نے اسے معاف فرما دیا اور اس طرح اپنی امت کے لوگوں کو یہ سبق دیا کہ کسی سے بدلہ لینے کے مقابلے میں معاف کر دینا زیادہ بہادری کی بات ہے۔

آپ نے جس یہودی کا واقعہ پڑھا وہ اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم تھا۔ جب حضورؐ نے اس کے ساتھ ایسا اچھا برتاؤ کیا تو وہ سچے دل سے مسلمان ہو گیا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ ایسی گستاخی میں نے جان بوجھ کر کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر حضورؐ سچے نبی ہوں گے تو ان میں برداشت کی قوت دوسروں سے زیادہ ہوگی۔

☆☆☆



شریر کو گرفتار کرا سکتے تھے، لیکن آپؐ نے صبر کیا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے بستر صاف کرنے لگے۔ اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ جس وقت یہودی وہاں سے بھاگا تو گھبراہٹ میں اپنی تلوار وہیں بھول گیا۔ راستے میں تلوار کا خیال آیا تو واپس پلٹا کہ شاید ابھی وہاں کوئی نہ آیا ہو جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا اور دیوار کے اوپر سے اندر جھانکنے لگا۔

یہ وہ وقت تھا جب اللہ کے محبوب ﷺ اپنے مبارک ہاتھوں سے بستر دھورہے تھے۔ یہودی کی اپنی قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا کہ غرور کی وجہ سے وہ اپنا جوتا بھی خود صاف نہ کرتے تھے، اپنا معمولی سے معمولی کام بھی غلاموں اور لونڈیوں سے کراتے تھے اور یہاں دونوں جہانوں کے سردار گندے بستر کو اپنے مبارک ہاتھوں سے دھورہے تھے۔

یہودی کے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا اور اسے یقین آ گیا کہ حضور ﷺ ضرور اللہ کے سچے رسول ہیں۔ کسی معمولی آدمی کا اخلاق اتنا اچھا نہیں ہو سکتا۔

وہ بے اختیار پکار اٹھا۔ ”یا رسول اللہ! مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔ میں معافی مانگتا ہوں اور کلمہ پڑھ کر سچے دل سے مسلمان ہوتا ہوں۔“ حضورؐ نے اسے تسلی دی کہ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے اور پھر اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیا۔

غصے پر قابو

ہمارے آقا اور اللہ کے سچے رسول حضرت محمد ﷺ دونوں جہانوں کے بادشاہ تھے۔ اللہ پاک نے آپ کو یہ اختیار دیا تھا کہ اپنے لیے جو چیز چاہیں، لے لیں لیکن آپؐ نہایت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ کو گھر کا خرچ چلانے کے لیے قرض لینا پڑتا تھا۔

ایک بار ضرورت پڑی تو حضرت بلالؓ نے، جو حضورؐ کے گھر کا انتظام چلاتے تھے، ایک یہودی سے کچھ رقم قرض لی اور پھر اتفاق یہ ہوا کہ قرض ادا کرنے کے لیے جو وقت مقرر ہوا تھا اس پر رقم ادا نہ ہو سکی۔

یہودی بہت لالچی اور سخت دل ہوتے ہیں۔ وقت پر رقم نہ ملی

شکل ہی بگڑ گئی۔ بڑی مشکل سے روتے ہوئے وہ اپنی پرانی حالت میں واپس آیا۔

تمام حروف کمرے میں ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ کچھ فرش پر اپنے نقطے سنبھالے ٹہل رہے تھے تو کچھ صوفے پر چڑھے اچھل کود رہے تھے۔ وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ باتوں کے درمیان ان میں بحث چھڑ گئی کہ کس حرف سے سب سے زیادہ اور اہم لفظ شروع ہوتے ہیں۔ سب شیخیاں بگھارنے لگے۔ جیم بولا: ”جنگ اور جذبہ مجھ سے شروع ہوتے ہیں میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔“

زے بولا: ”زندگی اور زلزلہ مجھ سے آتے ہیں۔“

میم نے لن ترانی کی: ”موت، مگرچھ اور مال کا آغاز مجھ سے ہوتا ہے۔“

غرض ہر کوئی خود کو سب سے برتر اور زبردست ظاہر کر رہا تھا۔ ان کی بحث بڑھتی گئی۔ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر غصہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ نے تو اپنی آستینیں چڑھا لی تھیں۔ کمرے میں ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ اس شور و غل سے دادی جان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کان لگائے کمرے سے آتی آوازیں سن رہی تھیں لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ اٹھ بیٹھیں۔

حروف کی بحث اب لڑائی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ وہ آگ بگولہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک ایک تحکم آمیز آواز کمرے میں گونجی، سب چونک پڑے۔ انہوں نے دیکھا ”آ“ اپنی مدد کو سنبھالے میز پر چڑھا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: ”میرے دوستوں ٹھہر جاؤ! یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

اس کی بات سن کر سب اپنی جگہ رک گئے اور خاموشی چھا گئی۔ آ لفت کا سب سے پہلا حرف تھا۔ سب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ بولا: ”تم لوگ شاید بھول گئے ہو کہ امن، اخلاق، تہذیب اور پیار جیسے الفاظ بھی تم سے ہی شروع ہوتے ہیں۔“ سب کے چہروں پر شرمندگی نظر آنے لگی۔

وہ دوبارہ بولا: ”تم بہت نادان ہو کیوں کہ تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو کہ لفت کا ہر لفظ بہت سے حرفوں سے مل کر بنتا ہے، جیسے جنگ میں تین حرف ہیں۔ یہ شروع تو جیم سے ہوتا ہے لیکن



قصہ ایک دوپہر کا

(جاوید بسام کراچی)

دوپہر کا وقت تھا، تیز ہوا چل رہی تھی۔ گھر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عاشریاں اپنی امی کے ساتھ خالہ کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ گھر پر دادی جان اکیلی تھیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تیز ہوا سے پام کے درخت کے پتے جھوم رہے تھے۔ درخت کے ساتھ ہی کھڑکی تھی، ہوا کے جھونکے کمرے میں آ رہے تھے۔ میز پر بہت سے اخبار اور کتابیں رکھی تھیں۔ ہوا سے اخبار پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کتابوں کے اوپر عاشریاں نئی جیبی لغت بھی رکھی تھی جو کچھ دن پہلے ابو نے لا کر دی تھی۔ عاشریاں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ آج کل ان کا یہی شغل تھا کہ لغت میں سے مشکل الفاظ تلاش کرتے اور گھر والوں پر اپنی قابلیت کا رعب جاتے رہتے۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ تیز ہوا کا جھونکا آیا اور عاشریاں لفت میز سے نیچے گر کر کھل گئی۔ ہوا سے اس کے ورق خود بخود پلٹ رہے تھے۔ اچانک اس میں سے الف نے اپنا سر باہر نکالا۔ اس نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا پھر اچک کر کتاب سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے اکیلا پن محسوس کیا تو بے کو آواز دی۔ بے بھی اپنے نقطے کو سنبھالے باہر چلا آیا۔ اس کے پیچھے پے نے بھی باہر چھلانگ لگائی اور چکنے فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ بس پھر تو تمام حروف ایک دوسرے کے پیچھے یکے بعد دیگرے باہر آتے چلے گئے۔ خوب شور مچا، ایسا لگا کسی اسکول کی چھٹی ہوئی ہے۔ اس افراتفری میں لٹے کی ط ادھر ادھر ہو گئی اور وہ بوکھلا کر اسے آوازیں دینے لگا۔ عین کی گردن مڑ گئی اور وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ چھوٹا بے چارہ دوسرے طاقت ور حرفوں کے پیروں تلے روند گیا جس سے اس کی

اگر نون اور گاف اس کا ساتھ نہ دیں تو یہ جیم کبھی جنگ نہیں بن سکتا۔
یہ سن کر تمام حروف کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ بات تو ان کے
دماغ میں آئی نہیں تھی۔ سب شرمندگی سے ہاتھ مل رہے تھے۔

دادی جان آہستہ آہستہ اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ
سوچ رہی تھیں، جا کر دیکھتی ہوں، وہاں کیا ہو رہا ہے۔

سب حروف سر جھکائے کھڑے ”آ“ کی تقریر سن رہے تھے۔
وہ کہہ رہا تھا: ”لڑنا جھگڑنا بری بات ہے اور غرور تو اللہ تعالیٰ کو
بالکل پسند نہیں ہے۔ تم لوگ وعدہ کرو آئندہ ایسا نہیں کرو گے۔“

سب نے ہاتھ اٹھا کر وعدہ کیا۔ اسی دوران راہ داری سے
قدموں کی آواز سنائی دی۔ تمام حروف تیزی سے اپنے نقطے، ط اور
مد سنبھالے کتاب کی طرف بھاگے اور ایک ایک کر کے واپس اس
میں چلے گئے۔

دادی جان کمرے میں داخل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ
پورے کمرے میں اخبار پھیلے ہیں، صوفوں کے کشن بھی نیچے گرے
تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے لغت اٹھا کر میز پر رکھی، پھر کھڑکی
بند کر کے کشن کو ان کی جگہ پر رکھا اور اخباروں کو سمیٹنے لگیں۔ اتنے
کام ایک ساتھ کر کے وہ تھک گئی تھیں۔ انہوں نے گہرے گہرے
سانس لیے اور بڑبڑائیں۔ ”لگتا ہے اس گھر میں چوہے بہت ہو
گئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے چلتیں کمرے سے
باہر نکل گئیں۔
(پہلا انعام: 150 روپے کی کتب)

سوہنی دھرتی

(عذرا بتول، لاہور کینٹ)

کیبل گئی ہوئی تھی، حامد نے بور ہونے کی بجائے پی ٹی وی کا
چینل لگا لیا اور خود کھڑکی کے پار اپنے خوب صورت لان کو دیکھنے
لگا۔ ایک دم حامد کے کانوں نے ایک آواز سنی جو کہ ایک نغمہ تھا۔

سوہنی دھرتی اللہ رکھے
قدم قدم آباد تجھے
قدم قدم آباد تجھے

تیرا ہر ایک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا
آنے والی نسلیں تیری عظمت کے گن گائیں

حامد اس نغمے کو سنتے ہی کسی خیال میں گم ہو گیا تھا۔ امی کے

ہلانے سے حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔

”حامد کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ تمہیں پتا ہے آج اسد کی
سالگرہ ہے اور ہمیں جلد از جلد جانا ہے، اس لیے جلدی سے ریڈی
ہو جاؤ! صرف 30 منٹ ہیں تمہارے پاس۔ شاباش! جلدی اٹھو۔“
امی یہ کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔ حامد جلدی سے اپنے کمرے
کی طرف گیا۔ تیار ہو کر اپنے والدین کے ساتھ اسد کی طرف
روانہ ہو گیا۔ کہنے کو تو یہ ایک چھوٹی سی سالگرہ تھی لیکن یہاں تو
شادی کا سماں تھا۔ پارٹی لان میں ارتج کی گئی تھی۔ ہر طرف برقی
لاٹیں روشن تھیں۔ لان کو کسی دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ ہر
طرف سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا کہ
سب لوگوں کی آج ہی سالگرہ ہے۔ پہلے حامد بھی خود پر بڑا غرور
کرتا تھا لیکن آج تو خلاف توقع حامد خاموش تھا۔ حامد کے والد
ایک بڑے پریس میں تھے۔ والدہ دو تین این جی اوز کی سربراہ
تھی۔ اگر دیکھا جاتا تو ان میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری
ہوئی تھی۔ حامد کی والدہ بے سہارا اور بیوہ خواتین کے لیے سرگرم
عمل تھی، جس کی شاخوں میں بیرون ممالک سے بھی لاکھوں روپے
امداد کے لیے آتے تھے۔

حامد کو دنیا کی ہر سہولت وافر مقدار میں ملی ہوئی تھی۔ حامد
اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہر طرف سے آزادی تھی۔ شہر کے
مہنگے اسکول سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہر سال فرسٹ پوزیشن میں
پاس ہوتا تھا۔ کبھی خود ہل کر پانی تک نہ پیتا تھا۔ حامد کے حلقہ
احباب میں بھی ہائی کلاس کے لوگ تھے۔ پارٹی کے اختتام پر گھر آ
کر حامد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج اس کو عجیب سی بے چینی لگی
ہوئی تھی جس کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کے ذہن پر بار
بار سوہنی دھرتی کے الفاظ برس رہے تھے۔ حامد سوچ رہا تھا کہ یہ
سوہنی دھرتی کیسی ہے، یہ ایسی کیوں ہے؟ کیا پاکستان ایسا ہے کہ
اس کو سوہنی دھرتی کہا جائے؟ یہاں تو قدم قدم پر غریبوں کی
آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ ہر طرف قتل و غارت، بم دھماکے اور خوف
و ہراس کی فضا رہتی ہے۔ بھوک لوگوں کو خودکشی کرنے پر مجبور کر
رہی ہے۔ اس دھرتی کا نظام کیسا ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ
ہو رہا ہے۔ حامد سوچتا رہا اور آخر اسے نیند آ گئی۔

صبح حامد کی آنکھ گھر میں امی کی اونچی آواز سے کھلی۔ حامد

کے کمرے کی جو کھڑکی لان میں کھلتی تھی، اس کے ذریعے آوازیں اندر آ رہی تھیں۔ حامد نے کھڑکی کے پاس جا کر دیکھا تو فرح جو کہ اس گھر کی نوکرانی تھی، رو رو کر فریاد کر رہی تھی۔ ”بی بی! خدا کے واسطے مجھے 10 ہزار روپے دے دیں، میری بچی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔“

”وہ مر جائے گی تو میں کیا کروں؟ مرتی ہے تو مرنے دو۔ جب دیکھو ہاتھ پھیلائے نظر آتی ہے۔ کام کی نہ کاج کی، دشمن اناج کی۔ یہاں سے دفع ہو جا۔ آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔ نہیں تو میرے سے بُرا کوئی نہ ہوگا، حرام کی اولاد۔“ حامد کی امی نے اسے بُری طرح جھڑک دیا۔ اس سے زیادہ سننے کی حامد میں ہمت نہ تھی۔ وہ جو اپنی امی کو آئیڈیل خاتون کہتا تھا، آج ان کا پول کھل گیا تھا۔ یہی ایک لمحہ تھا کہ حامد پر آگاہی کا سامنا ہوا۔ کہاں صحیح تھا، کہاں کیا غلط تھا۔ اس کو سب سمجھ آ گیا۔ وہ اپنی الماری کی طرف گیا۔ الماری کا دروازہ کھولا جس میں نوٹوں کی دس بارہ گڈیاں پڑی ہوئی تھیں جو اس کے والدین نے مختلف موقعوں پر اس کو دی تھیں۔ حامد نے جب نوٹوں کو چیک کیا تو وہ پورے دس لاکھ تھے۔ حامد نے ایک لاکھ اس میں سے علیحدہ کیا اور لے کر باہر آ گیا۔ اس کی امی ابھی ابھی گاڑی لے کر باہر نکلی تھی۔

حامد گیارہویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن گاڑی بڑی مہارت سے چلا رہا تھا۔ اس کا رخ کچی آبادی کی طرف تھا جہاں سے فرح بوا آتی تھی۔ گاڑی ایک طرف روک کر وہ پیدل فرح بوا کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر کے دروازے پر ایک میلا کچھلا پردہ لٹک رہا تھا۔ حامد کو اس سے بھی بدبو نہ آئی کیوں کہ آج اس کا دماغ درست تھا۔ گھر کے اندر جا کر دیکھا تو وہ مٹی کا بنا ہوا ایک مکان تھا۔ حامد بابو کو دیکھ کر فرح بوا جو کہ رو رہی تھی، حامد کی طرف لپکی۔

”خیریت، حامد بیٹا!“

”ہاں! بوا جی، یہ کچھ پیسے ہیں۔ یہ رکھ لیں اپنی بیٹی کے علاج کے لیے۔“ حامد کے ہاتھ سے پیسے لے کر اس نے حامد کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ حامد کو آج سچی خوشی ملی تھی اور وہ بہت ہی مسرور انداز میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور اپنے ذہن میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا کہ اس نے اپنی دھرتی کو آباد کرنا ہے،

نہ کے برباد۔ اس نے اپنے وطن کے ذرہ ذرہ سے پیار کرنا ہے۔ حامد کی نظر ایک دیوار پر لگے ہوئے پوسٹر پر پڑی جس پر غریب اور بے سہارا بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے امداد کی اپیل کی ہوئی تھی۔ حامد کی گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ حامد نے گھر پہنچ کر دس لاکھ کا چیک ان کو دیا۔ ساتھ ہی اپنی گاڑی اور نو لاکھ مزید دینے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اب اس کی نظر رکشے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی زبان پر ایک ہی ورد جاری تھا۔ سوئی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے، قدم قدم آباد تجھے۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

قطرے

(حمزہ کامران، لاہور)

”یار بشیر! یہ بابا جی کون ہیں؟“ اکرم نے چائے کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے محلے دار سے پوچھا۔

”پتا نہیں یار! شاید محلے میں نئے آئے ہیں۔“ بشیر نے متانت سے جواب دیا۔ وہ شاید بابا جی کے نورانی چہرے سے متاثر ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کاموکی سے 200 میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ شہری علاقے سے دور ہونے کے سبب یہ قصبہ ”خیرپور“ کافی پسماندہ تھا اور لوگ زمین کے سینے پر گندم اگا کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتے تھے۔

بابا جی کون تھے، کہاں سے آئے تھے، کسی کو نہیں پتا تھا۔ وہ اتنے ضعیف نہیں تھے مگر شاید بیماریوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ معذور ہونے کی وجہ سے وہ ویل چیئر کی مدد سے ادھر ادھر جاتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنا ان کا خاصا تھا اور ان کی یہی ادا ہر ایک کو بھاتی تھی۔ اسی لیے چند ہی دن میں بابا جی نے خیرپور کے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا، سب ان کا یکساں احترام کرتے اور آتے جاتے سلام کرتے۔ بابا جی بھی ہر لمحے انہیں دعائیں دیتے رہتے۔ وہ بس نماز کے لیے اپنی ویل چیئر پر مسجد تک جاتے، ورنہ دن بھر گھر کے اندر یا دروازے پر بیٹھے رہتے۔

پورے قصبے میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ لوگ قرآن پاک پڑھنا تو جانتے تھے مگر لکھنا کسی کو نہ آتا تھا۔ دوسری طرف بابا جی پڑھے لکھے تھے۔ یوں وہ خط یا دوسرے لکھنے پڑھنے کے کام کر کے اپنے

گھر بیٹھے پیسے کماتے اور زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیلتے۔ یوں زندگی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔

”باباجی، پتا ہے، ابا نے بتایا ہے کہ آج شہر سے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔“ امجد ایک ٹانگ پر اچھلتے ہوئے تو تلی زبان میں بولا۔ وہ 4 سال کا تھا اور باباجی کے ہمسایہ میں رہتا تھا۔ اس کی ماں ٹی بی کی وجہ سے چل بسی تھی اور باپ دن بھر کھیتوں میں رہتا تھا۔ اسی لیے وہ دن بھر باباجی کے گھر آ کر ان سے کھیلتا اور باتیں کرتا رہتا۔ باباجی بھی اس کی اٹھکیلیوں سے محفوظ ہوتے رہتے۔ کچھ دیر کھیلنے کے بعد امجد چلا گیا۔ باباجی اس کے آنے کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک باہر سے زور زور سے بولنے اور جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

”تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے بیٹے کے قریب آنے کی؟“ امجد کے باپ کے دھاڑنے کی آواز آئی۔

”میں تو کہتا ہوں کہ انہیں اسی وقت قصبے سے باہر نکال دو۔“ اکرم بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔ باباجی گھبرا کر تیز تیز اپنی ویل چیئر کے پیسے گھماتے باہر نکلے۔ امجد کے گھر کے باہر رش لگا ہوا تھا۔ امجد بھی ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ باباجی نے بشیر سے پوچھا۔

”باباجی، غضب ہو گیا ہے۔ شہر سے پولیو کے قطرے پلانے والے لوگ آ گئے ہیں۔ وہ تو شکر ہے ہم وقت پر پہنچ گئے ورنہ یہ تو امجد کو یہ خطرناک سرخ قطرے پلانے والے تھے۔“ بشیر اجنبیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا، جنہیں خیر پور کے لوگوں نے گریبان سے پکڑ رکھا تھا۔

”میں نے تو سنا ہے کہ ان قطروں سے بچوں کی نشوونما رک جاتی ہے۔“ اکرم نے بشیر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ارے، دیکھو! باباجی کھڑے ہو رہے ہیں!“ مجمع میں سے کسی نے آواز لگائی۔ سب نے چونک کر باباجی کو دیکھا۔ باباجی اپنی ویل چیئر کو پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ زور لگانے کی وجہ سے ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا اور ٹانگوں میں جان نہ ہونے کی وجہ سے وہ دھم سے اپنی ویل چیئر پر گر گئے۔

”ارے باباجی، کیا کر رہے ہیں آپ! اور..... آپ کی آنکھوں میں آنسو.....؟“ سب پولیو ٹیم کو بھول کر باباجی کی طرف لپکے۔

”بیٹا! میں دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کھڑا نہیں ہو سکتا، جس کی وجہ معلوم ہے کہ کیا ہے؟ پولیو۔ میں 3 سال کی عمر میں پولیو کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے بھی یہ قطرے نہیں پیے تھے کیوں کہ ہمارے زمانے میں یہ دریافت نہیں ہوئے تھے۔

اس دن سے میں نے اپنی معذوری کی وجہ سے جو مشکلات جھیلیں تم سوچ بھی نہیں سکتے اور تم اپنے بچوں کو بھی اس معذوری کی طرف دھکیل رہے ہو۔ آخر کیوں؟ یہ دوسرے قطرے تو عمر بھر کی معذوری سے بچانے کا وسیلہ ہیں، ناکہ نشوونما روکتے ہیں اور اگر تمہیں ان شہر سے آئے لوگوں پر اعتبار نہیں ہے تو خود شہر جا کر اپنے بچوں کو یہ قطرے پلا دو مگر خدارا، اپنے بچوں پر رحم کرو اور ان پر یہ ظلم نہ ڈھاؤ۔“ باباجی مسلسل بولنے کی وجہ سے ہانپنے لگے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لوگوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

آخر امجد کے باپ نے سکوت توڑا اور پولیو ٹیم کے پاس جا کر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”مجھے معاف کر دو اور امجد کو یہ قطرے پلا دو۔“ سب کے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

(تیسرا انعام: 90 روپے کی کتب)

انمول باتیں

- * سورج کی طرح شخصیت اپناؤ جو ہمیشہ کرنیں بکھیرتا ہے۔
- * انسان کامیاب ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے مگر اپنی غفلت سے خود کو ناکام بنا دیتا ہے۔
- * پانی بنو جو خود اپنا راستہ بناتا ہے، پتھر نہ بنو جو دوسروں کا راستہ روکتا ہے۔
- * جو انسان اپنے اصول مرتب نہیں کرتا، اسے دوسروں کے اصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔
- * اگر تم بادشاہ بھی ہو تو اپنے والدین اور استاد کی تعظیم میں کھڑے ہو جاؤ۔
- * مصیبت کی برداشت کے لیے نماز اور صبر کا سہارا لو۔
- * امیر ہو تو غریبوں اور لاوارثوں کی عزت کرو، تم بھی اس حالت میں آ سکتے ہو۔
- * تحریر ایک خاموش آواز ہے اور قلم ہاتھ کی زبان ہے۔
- * جو لوگ تکبر کرتے ہیں خدا انہیں پسند نہیں کرتا۔
- * علم جہاں سے ملے اسے حاصل کر لو، چاہے اسے کہنے والا خود اس پر عمل پیرا نہ ہو۔
- * یادیں آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی طرح ہوتی ہیں۔ بھلا ستاروں کو چمکنے سے کوئی روک سکتا ہے؟
- * سورج کی روشنی میں زمین کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں اور علم کی روشنی میں زندگی کے نشیب و فراز۔ (عاکف شہزاد، جہلم)

انعام



صدیوں پرانی بات ہے کہ بخارا کا شہنشاہ اپنی نیک دلی اور سخاوت میں شہرت رکھتا تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے آخری زمانے میں، بخارا میں علم و ادب کا چرچا گھر گھر تھا۔ وہاں رعیت (رعایا) خوشحال، زمینیں سرسبز اور سڑکوں اور گھروں میں روشنی ہی روشنی تھی۔ تقریباً سارے بچے مکتب و مدرسے میں پڑھنے جاتے تھے۔ اللہ اور رسول کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ عالموں اور ہنرمندوں کی قدر ہوتی تھی۔ بیماروں اور معذوروں کا علاج ہوتا تھا۔ چرند پرند بھی خوش اور پھول پتے بھی لہلہاتے تھے۔ شہنشاہ خود تندرست اور خوش مزاج تھا اور کھیل کود کے مقابلوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس لیے سارے ملک میں نوجوان چاک و چوبند، صحت مند اور پھرتیلے تھے۔ عید تہوار اور بڑی تقریبوں میں عوام جوش و جذبے سے شامل ہوتے تھے۔ سب بادشاہ کی دل و جان سے عزت کرتے تھے اور اس کی درازی عمر کی دعا کیا کرتے تھے۔

میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ انسان کی صحت کے ساتھ بیماری بھی لگی رہتی ہے اور ہر ایک کو ایک نہ ایک دن بوڑھا بھی ہونا ہے۔ شہنشاہ کی عمر ستر پچھتر سال تھی۔ بس ایک دن کیا ہوا کہ شہنشاہ شام کے وقت گھوڑے کی سواری سے واپس محل آیا تو اس کے سر میں شدید درد ہوا اور بخار ہو گیا۔ سارے ملک سے ماہر حکیم اور ملک کے باہر سے بھی نامور حکیم بلوائے گئے۔ بخار اور شدید ہو گیا، درد کی بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ باوجود اعلیٰ خوراک اور ہر طرح کے آرام کے، شہنشاہ کمزور ہوتا چلا گیا۔

ایک صبح ایک خوب صورت نوجوان حکیم شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اب تک بادشاہ کی اس عجیب بیماری کو کوئی سمجھ نہیں سکا ہے۔ اس نوجوان حکیم نے کہا۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔“ اس نوجوان کی آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں کی سی چمک اور تیزی تھی، کشادہ

چلو بچو! اندر چلو، آج شام سے بڑی سردی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میں کب سے تمہاری راہ تک رہی ہوں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پاس بیٹھو نا، اور سناؤ کہ کھیل کیسا رہا؟ کون جیتا، کون ہارا؟ ہاں! یہ جو گھٹنے چھل گئے ہیں، کہنیاں رگڑی گئی ہیں، تو بولو دوا لگاؤں؟

ابھی تھوڑی دیر پہلے بابر میاں میری گود میں سر رکھے اور میری شال اوڑھے لیٹے تھے اور بار بار یہی کہتے تھے۔ ”وہی والا گانا، وہی والا گانا“ آخر ہم نے سنایا۔

آؤ بچو سیر کرائیں
تم کو دور دیس کی
انعام ملے اور خوشیاں بھی
سنو کہانی اور بنو دوست
ہنسو کھیلو، جگ جگ جیو
آؤ آؤ آؤ بچو

لو! عثمان، منے اسد کی انگلی پکڑے چلے آ رہے ہیں۔ بچو! میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں۔ آج تمہیں بڑے دور دیس کی اور بہت پرانے وقتوں کی کہانی سناتی ہوں۔

پیشانی، ستواں ناک اور آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ معلوم نہیں کیوں شہنشاہ کو اس نوجوان حکیم کی شخصیت اچھی معلوم ہوئی۔

شہنشاہ نے اجازت دے دی کہ وہ ان کی ساری رپورٹوں اور دوائیوں کا مطالعہ کرے اور علاج شروع کرے۔ نوجوان حکیم نے شہنشاہ کا بڑے خلوص اور اپنی تمام تر عقل و لیاقت کے ساتھ اکیس دن تک علاج کیا۔ شہنشاہ کی بیماری جاتی رہی۔ انہوں نے پانچ دن مزید بستر پر آرام کیا اور پھر غسل صحت کیا۔ پورے بخارا میں، عوام نے نماز شکرانہ ادا کیا۔ اس نماز کے بعد ایک شاہی معیار کی تقریب ہوئی جس میں پہلے خیرات و صدقے تقسیم ہوئے اور پھر وزیروں، مشیروں اور شہر کے دیگر معزز لوگوں کے لیے دربار لگایا گیا۔

اس شاہی تقریب میں اور دربار میں اس نوجوان حکیم کو بھی مدعو کیا گیا جس نے شہنشاہ کا علاج کیا تھا۔ اس نوجوان کو انعام دینے کا معاملہ زیر غور آیا۔ شہنشاہ نے معلوم کیا کہ ”اے لائق حکیم تو اپنی خدمت کے سلسلے میں ہم سے عہدہ و مرتبہ چاہتا ہے، زمین یا محل کا طلب گار ہے یا تجارت کے لیے دولت چاہتا ہے؟“

نوجوان حکیم بالکل چپ رہا۔ وزیروں کو گمان گزرا کہ وہ ادب کی وجہ سے چپ ہے، شاید وہ ہیرے یا قوت لینا چاہتا ہو۔ پوچھنے پر بھی نوجوان حکیم خاموش رہا۔ کچھ مشیروں نے شہنشاہ کے حکم پر یہ بھی معلوم کیا کہ شاید وہ تاحیات محل میں رہائش چاہتا ہو۔ کوئی شاہی سند یا مخصوص تمنے کی تمنا رکھتا ہو یا اپنے خاندان کی کفالت کی آرزو رکھتا ہو، لیکن ان سب باتوں کو سن کر بھی وہ نوجوان حکیم آنکھیں نیچی کیے چپ کھڑا رہا۔ اس کی اس بے نیازی پر شہنشاہ، سارے درباری، وزراء، امراء اور ذاتی ملازمین بڑے حیران تھے۔

شہنشاہ نے نوجوان حکیم پر ذرا زیادہ توجہ دی اور کچھ نہ کچھ انعام لینے پر بار بار اصرار کیا۔ تب وہ نوجوان حکیم بولا۔

”عالی جاہ! مجھے ہمیشہ کے لیے شاہی کتب خانے میں کتابیں پڑھنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس انعام کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ اس اجازت کے ملنے کے بعد نوجوان حکیم ہمیشہ شاہی کتب خانے سے کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ برس ہا برس گزر گئے اور وہ مسلسل علم کا انعام حاصل کرتا رہا۔

میرے پیارے بچو! جب سے یہ دنیا بنی ہے لوگ ہر طرح

کے مقابلوں میں نمایاں کام یابی حاصل کرتے رہے ہیں اور بہت سونے بڑے بڑے کام کر کے حکمرانوں کی نگاہ میں عزت پائی مگر ایسے انسان بہت ہی کم ہیں جو اپنے انعام کو آنے والے انسانوں کے لیے بھی انعام بنا دیں۔ بھلا سوچو تو یہ نوجوان حکیم کون تھا؟ یہ بوعلی سینا تھے۔

بوعلی سینا کا پورا نام علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا تھا۔ آپ کے بزرگ بلخ کے رہنے والے تھے۔ بوعلی سینا بخارا میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ آپ نے بڑی خوش دلی کے ساتھ دس سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کیا اور چند دیگر کتابوں پر بھی عبور حاصل کیا۔ وہ بچپن میں بڑے ذہین اور پھرتیلے تھے۔ وہ کھانا مقدار میں کم کھاتے تھے لیکن اچھی صحت مند چیزیں کھاتے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھاتے تھے۔ وہ بڑوں کا ادب کرتے اور کہنا مانتے تھے۔ وہ روز رات کو اللہ کا شکر ادا کر کے سوتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے۔ ”اگر میں اللہ کا روز شکر ادا نہیں کروں گا تو زندہ کیسے رہوں گا۔“ بوعلی سینا کے بچپن کے ایک استاد نے آپ کے بارے میں یہ کہا تھا۔ ”میرا شاگرد بخارا کا انعام ہے۔“

میرے بچو! یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ صرف ایک مضمون میں الگ سے مہارت حاصل نہیں کرتے تھے جیسے آج کل کرتے ہیں۔ اس لیے بوعلی سینا نے سولہ سال کی عمر سے ہی مذہبی تعلیم فلسفہ، ریاضیات (حساب) منطق اور طب کی تعلیم میں مہارت حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی وہ شاہی کتب خانے سے اپنا علم بڑھاتے رہے۔

بچو! یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بوعلی سینا بڑے نیک اور خاموش طبع تھے۔ وہ سب سے انکساری سے ملتے تھے اور علم کے نامور استاد بن جانے کے بعد بھی کہا کرتے تھے۔ ”علم تو کائنات پر چھایا ہوا سمندر ہے اور ابھی تو میرے ہاتھ بھی گیلے نہیں ہوئے۔“ وہ ساری ساری رات سائنسی تحقیق میں مصروف رہتے اور اسی سلسلے میں دور دراز کے سفر بھی کیے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بوعلی سینا نے کبھی باقاعدہ طور پر کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ خود ساری کتابوں کا گہرا مطالعہ کرتے رہے۔ انہیں سب سے زیادہ

لگاؤ طب سے تھا۔ ان کی کتابیں ”القانون فی الطب“ اور ”کتاب الشفاء“ ہر زمانے اور ہر ملک میں شہرت رکھتی ہیں۔

ہزاروں سال قبل بوعلی سینا کی کتابوں کے ترجمے لاطینی زبان میں ہوئے۔ خاص کر یہ دونوں کتابیں طب کی دنیا میں انقلاب لے آئیں اور یہ موجودہ طب کی بھی بنیادی کتابیں کہلاتی ہیں۔ آپ نے اکیس سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا تھا اور آخری سانس آنے تک لکھتے رہے۔

بوعلی سینا کی کتاب ”القانون فی الطب“ اٹھارویں صدی عیسوی تک تمام یورپ کی میڈیکل یونیورسٹیوں میں کورس میں پڑھائی جاتی رہی۔ انہوں نے طب، سرجری، فلکیات اور مختلف دوائیوں اور ایجادوں پر مستند کتابیں لکھیں۔ بوعلی سینا کا سائنسی معلومات اور فلسفے کی کتابوں کا دنیا کی زیادہ تر عظیم زبانوں میں

قرآن مجید میں سرسری کا ذکر

قرآن حکیم میں سرسری کے لیے لفظ قملہ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اس سے سرسری اور جوں کے علاوہ کٹی اور حشرے بھی مراد لیے جاتے ہیں۔ سرسری کا ذکر ساتویں سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 133 کی ابتداء میں ہوا ہے، جس کا ترجمہ یوں ہے۔ ”آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، مڈی دل چھوڑے، مینڈک نکالے، سرسریاں پھیلا دیں اور خون برسایا۔“

سرسریوں کے تباہ کن حملہ کی خوف ناک کہانی

یہ سنسنی خیز قرآنی کہانی بھی بڑی عبرت ناک ہے۔ جب حضرت موسیٰ کی سرکش قوم نے اپنی نافرمان روش بدلنے سے صاف انکار کر دیا تو ان پر طرح طرح کے عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان عذابوں میں سے ایک لا تعداد سرسریوں کا تباہ کن حملہ بھی تھا۔ اس مہلک حملے سے ان کے غلے کے تمام گودام تباہ و برباد ہو گئے۔ اس سے غذائی صورت اور عمومی حالات بے حد مخدوش ہو گئے اور ان لوگوں کی ساری زندگی طرح طرح کی الجھنوں، دقتوں اور اذیتوں کا شکار ہو گئی۔ سرسریوں کے حملے کا عذاب بھی اس وقت ملا جب حضرت موسیٰ سے درخواست کی گئی کہ وہ

ترجمہ موجود ہے۔ مثلاً لاطینی، انگریزی، فارسی، جرمن، فرانسیسی، چینی، بنگالی، سنسکرت اور اردو میں ترجمے موجود ہیں۔

دیکھو ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ وہ دور جسے ہم پندرہویں اور سولہویں صدی کے نام سے یاد کرتے ہیں، مسلمانوں کا علم اور تہذیب و تمدن عروج پر تھا۔ اہل مغرب نے مسلمان فلسفیوں، طبیعوں، عالموں اور سائنس دانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی کتابیں پہلے لاطینی اور پھر انگریزی میں ترجمہ کر کے پھیلانیں۔ مسلمانوں کی لکھی شاہکار کتابیں صدیوں تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ ان ممتاز اور نامور ہستیوں میں بوعلی سینا کا نام سرفہرست ہے۔ سچ ہے کہ بوعلی سینا نے نہ صرف خود انعام لیا بلکہ ان کا علم ہم سب کے لیے ہمیشہ انعام رہے گا۔

☆☆☆



اللہ تعالیٰ سے رحیم کی دعا فرمائیں۔

عذاب سرسری کی سنسنی خیز کہانی کا سبق

سرسریوں کی ہولناک یلغار اور غلے کے گوداموں کی مکمل تباہی کی عبرت ناک کہانی بھی بہت سبق آموز ہے۔ کسی سرکش قوم کو اللہ تعالیٰ کسی وقت بھی اپنی گرفت میں لے کر اس کے تمام دنیاوی اور مادی وسائل تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ اس لیے سلامتی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہر اس فعل اور حرف سے پرہیز کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو۔

سرگرمیاں

سورج مکھی کا پھول بنائیں۔

اشیاء: کاغذ کی چھوٹی پلیٹ، گتے کی نلکی، سورج مکھی کے بیج، پیلے اور سبز رنگ کے کاغذ، قینچی، گوند، اسٹپلر۔
طریقہ: پھول کا تنا بنانے کے لیے کاغذ کی نلکی کے گرد سبز کاغذ کو گوند سے چپکائیں۔



پھول کی پتیاں بنانے کے لیے کاغذ پر چھوٹے بچے کا ہاتھ رکھ کر اس کا خاکہ اتار لیں۔ ان کو احتیاط سے کاٹ لیں۔ اس طرح کے چھ خاکے بنائیں۔



کاغذ کی چھوٹی پلیٹ کے گرد ہاتھ کے خاکوں کو اسٹپلر سے پن لگائیں۔ یہ پھول کی پتیاں بن گئیں ہیں۔



پلیٹ کے درمیان میں گوند کی پتلی تہہ جما کر اس پر سورج مکھی کے بیج ڈال دیں۔



تنے کے اوپری حصے کو دبائیں اور اسے پلیٹ کے درمیان سے اسٹپل کر دیں۔ آپ کا سورج مکھی کا پھول تیار ہے۔



آئیے الیکٹرو اسکوپ بنائیں۔

اشیاء: شیشے کی بوتل، المونیم کی پلیٹ، تانبے کا تار، کسی دھات کا ورق۔

طریقہ:

الیکٹرو اسکوپ اس آلے کو کہتے ہیں جس کی مدد سے برقی بار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ آلہ آپ خود بھی بنا سکتے ہیں۔ ایک ایسی خالی اور خشک بوتل لیں جس میں جام یا شہد بکتا ہے، پھر پیتل کا ایک تار لے کر اسے زیڈ کی شکل میں موڑ لیں۔ اس کا ایک سرا (جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے) بوتل کے منہ میں رہے گا، دوسرے سرے پر چاندی یا کسی اور دھات کا ورق رکھ کر اسے بوتل کے اندر لٹکا دیں۔ بوتل کے منہ کے اوپر المونیم کی کوئی پلیٹ رکھ دیں۔

اگر یہ سب چیزیں اچھی طرح خشک کر لی گئی ہیں تو جب برقی ہوئی گنگھی پیتل کے تار کے قریب لائی جائے گی تو بوتل کے اندر چاندی کے ورق ایک دوسرے سے پرے ہٹ جائیں گے۔





مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

کیا حال ہیں آپ کے؟ مارچ کا شمارہ جلد مل گیا تھا۔ کہانیاں ہمت کرے انسان، نیلو کی شامت، آؤ تجدید عہد کریں، ڈاکو بھائی، میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا، سبق آموز اور لا جواب تھیں، مسٹر لال بیگ نے تقریر سنی پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ پورا شمارہ آپ کی محنت اور کاوش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(شاہد فضل کریم، راول پنڈی)

مارچ کا شمارہ پڑھا، بہت لطف اندوز ہوئی۔ تمام تحریریں عمدہ تھیں، مگر میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا سب سے عمدہ تحریر تھی۔

(شہزینہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

مارچ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ڈاکو بھائی، ایسے ملا کرو اور میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا، عمدہ تحریریں تھیں۔

(اسامہ چوہدری، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے 5 مہینے ہو گئے ہیں۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور گھر بیٹھے دنیا کی سیر کر لیتا ہوں۔ مہربانی فرما کر کرکٹ یا دوسرے کھیلوں کے بارے میں بھی معلومات شائع کریں۔

مارچ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ معجزات رسول، معلومات عامہ، مختصر مختصر، اس سے بڑھ کر صلاح الدین ایوبی بہت اچھی لگیں۔

(محمد عثمان حیدری، جھنگ)

☆ پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی تجویز پر ضرور غور کریں گے۔

مارچ کا شمارہ بہت مزے کا تھا۔ ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی۔ آپ کو کہانیاں بھیج رہی ہوں، ضرور شائع کریں۔ میرا خط بھی ضروری شامل کیجیے گا۔

(علیہ نورین، لاہور)

☆ پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی کہانیاں مل گئی ہیں۔ معیاری ہونیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

مجھے مارچ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ہر کہانی دلچسپ تھی۔ تعلیم و تربیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شمارہ اس مہینے کے دلچسپ واقعات سے متعلق ہوتا ہے۔

(نور رمضان، فیصل آباد)

مارچ کا سرورق بہت اچھا تھا۔ مزا آیا۔ مارچ میں ہمارے سالانہ امتحان ہیں پھر بھی میں نے پورا تعلیم و تربیت پڑھا ہے۔ دُعا کریں اللہ مجھے اعلیٰ پوزیشن عطا کرے۔

(عشرہ امین، لاہور)

☆ آپ کے سالانہ امتحان میں اول پوزیشن کے لیے دُعا گو ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب بچوں کو امتحانات میں کامیاب کرے۔ آمین! تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ شمارہ ہے۔ مارچ کا شمارہ بہترین تھا۔

آپ اسی طرح ترقی کرتے رہیں۔ آمین! (جویریہ عمران، لاہور)

مارچ کا شمارہ بہت عمدہ تھا۔ چچا تیز گام کو نہ پا کر دل اُداس ہو گیا۔ صلاح الدین ایوبی، میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا اور ایسے ملا کرو عمدہ کہانیاں تھیں۔

(علیزہ، لاہور)

☆ آپ کی اداسی ختم کرنے کے لیے چچا تیز گام واپس آ گئے ہیں۔

تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو سلام کہنا چاہتی ہوں۔ مارچ کے شمارے کی سب کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔

(ایمن امجد، راول پنڈی)

مارچ کا رسالہ بہت ہی زبردست تھا۔ اُف یہ موٹاپا، ڈاکو بھائی، ایسے ملا کرو، میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ پیارا پاکستان نظم اور معجزات رسول بہت اچھے تھے۔ تعلیم و تربیت پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ اس سے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔

(بلال احمد، حسن ابدال)

مجھے صلاح الدین ایوبی بہت پسند آیا اور باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

(محمد ابو ہریرہ، علی پور چٹھہ)

مارچ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خاص طور پر نیلو کی شامت کہانی تو بے حد پسند آئی۔ اس کے علاوہ مسٹر لال بیگ نے تقریر سنی بھی پسند آئی۔ میری تجویز ہے کہ جوڈو کراٹے پر سیریز لکھی جائیں تاکہ بچوں کو صحت مند اور مفید ہنر سیکھنے کا شوق پیدا ہو۔

(تاشفین بنت یوسف، فیصل آباد)

☆ آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے۔

مارچ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ اگلے ماہ میری سال گرہ ہے۔ مجھے پرندے پالنے کا

بہت شوق ہے ان پر بھی مضمون شائع کریں۔ (مآب زینت، جہلم)

☆ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ آپ کو ہم سب کی طرف سے سال گرہ مبارک ہو۔

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ میرے گھر والے بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن و گنی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین!

(عائشہ کریم، ملتان)

☆ آپ کی پسندیدگی اور دعاؤں کے لیے شکر گزار ہیں۔

مارچ کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ آئیے عہد کریں میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ (ذیشان صدیق، لاہور)

تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ مارچ کا شمارہ عمدہ تھا۔ آپ اسی طرح ترقی کرتے رہیں، آمین۔ میرا خط ردی کی ٹوکری میں پھینک کر میرا دل نہ دکھائیے گا۔ (انفراج اکبر، لاہور)

☆ پسندیدگی کا شکریہ۔ ہم نے آپ کا دل نہیں دکھایا۔ جواب حاضر ہے۔

مارچ کا شمارہ زبردست تھا۔ میں 5 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ اُف یہ موٹاپا اور ڈاکو بھائی زبردست کہانیاں تھیں۔

(محمد سعد سلمان، لاہور)

مارچ کے شمارے کا سرورق زبردست تھا۔ کہانیاں ہمت کرے انسان، نیلو کی شامت، اُف یہ موٹاپا، ڈاکو بھائی، مسٹر لال بیگ نے تقریر سنی اور میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا، زبردست تھیں۔ (سعد علی، سرگودھا)

اس ماہ مزے دار کہانیاں پڑھیں۔ حمد، نعت پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ پیارا پاکستان میں پاکستان پر جان نثار کرنے کا جذبہ، ہمت کرے انسان، نیلو کی شامت، پیارے اللہ کے پیارے نام، آؤ تجدید عہد کریں، معجزات رسول، سنہرے لوگ، مسٹر لال بیگ، اُف یہ موٹاپا میں کھانے کا مزا، صلاح الدین ایوبی میں دین اسلام کے لیے جذبہ، میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا، ایسے ملا کرو زبردست رہیں۔

(محمد فریاد قادری، کاموکی)

مارچ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ (محمد مجیر خان، بھکر)

میں تعلیم و تربیت میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ مارچ کا شمارہ زبردست تھا۔ مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔

(عاقب جنید، چواسیدن شاہ)

مارچ کے شمارے میں اُف یہ موٹاپا، مسٹر لال بیگ نے تقریر سنی، ایسے ملا کرو، میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا اور ڈاکو بھائی مزے کی کہانیاں تھیں بلکہ یہ رسالہ ہی لا جواب تھا۔ اُمید ہے کہ اپریل کا اس سے بھی زیادہ مزے دار ہوگا۔ (مریم احمد، گلگت)

مارچ کا شمارہ اچھا تھا۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے جس میں درس قرآن و حدیث، آئیے مسکرائیں اور سوال یہ ہے کہ مجھے بہت پسند ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے اسے ضرور شائع کریں۔

(مہتاب احمد، میٹھا خیل، کرک)

تعلیم و تربیت مارچ کا شمارہ سرورق سے لے کر بلا عنوان تک ہر لحاظ سے زبردست تھا۔ ڈاکو بھائی، نیلو کی شامت اور ہمت کرے انسان بالترتیب پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ معلومات عامہ نے واقعی معلومات میں بہت اضافہ کیا۔ تمام اراکین کو میرا سلام۔ (کیڈٹ عبداللہ بن نعیم، جہلم)

☆ پسندیدگی کا شکریہ۔

مارچ کا شمارہ زبردست تھا۔ نیلو کی شامت، ڈاکو بھائی اور میں ڈاکٹر نہیں بنوں گا بہترین کہانیاں تھیں۔ سرورق بہترین تھا۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ (مشعل غفران، لاہور کینٹ)

پہلی بار تعلیم و تربیت لیا۔ مجھے بے حد پسند آیا۔ خاص طور پر نیلو کی شامت، پیارا پاکستان اور اُف یہ موٹاپا بہت پسند آئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دن و گنی رات چوگنی ترقی دے۔ (عمیر یونس، چیچہ وطنی)

☆ دعاؤں کا بہت شکریہ۔ اُمید ہے تعلیم و تربیت کا مطالعہ جاری رکھیں گے۔

تعلیم و تربیت میں بہت اچھی کہانیاں ہوتی ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔

(بلال صغیر، فیصل آباد)

مارچ کا شمارہ اپنی تمام تر خوب صورتیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ نیلو کی شامت، اُف یہ موٹاپا کہانیاں پسند آئیں۔ پیارے اللہ کے پیارے نام، اخلاص، معجزات رسول، معلوماتی اور روح پرور تھا۔ باقی تحریریں بھی پسند آئیں۔ (وجیہہ بابر شفیق، بھلوال)

☆☆☆

شریر بندر



بنانے کے لیے پیڑ کے تنے میں کیل ٹھونک کر لٹکا دیا۔ جب وہ لوگ اپنا سارا سامان پیڑ کے نیچے چھوڑ کر دریا کے کنارے نہانے چلے گئے تو گوگا بندر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ نیچے ٹوکری میں رکھے کیلے اور سیب دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ وہ چپکے سے درخت سے اترا اور پھلوں پر ٹوٹ پڑا۔ کیلا کھاتے ہوئے اس کی نظر آئینے پر پڑی۔ پہلے تو اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے طرح طرح کے پوز بنا کر دیکھے پھر اس کے شرارتی ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ آئینہ بغل میں دبا کر بانس کے جنگل میں غائب ہو گیا۔

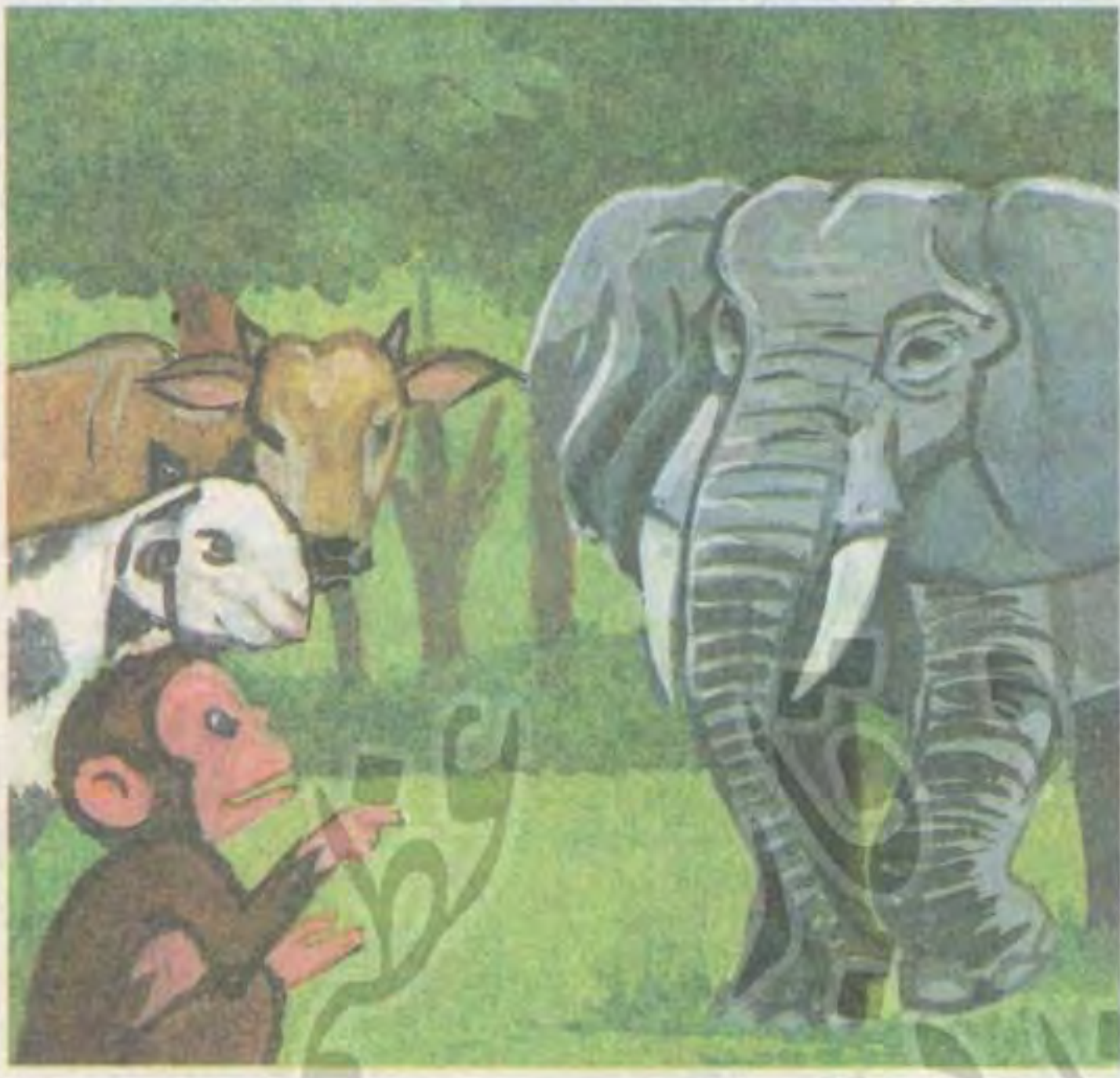
تیسرے پہر جب وہ لوگ دریا سے واپس آئے تو دیکھا کہ چاروں طرف کیلے کے چھلکے بکھرے پڑے ہیں اور آئینہ بھی غائب ہے۔ بہر حال جب سب لوگ چلے گئے تو گوگا بندر آئینہ لے کر جھاڑی میں سے برآمد ہوا اور درخت پر چڑھ کر آئینہ شاخوں میں پھنسا کر اس کا رخ زمین کی طرف کر دیا۔

اب گوگا بندر خراماں خراماں امرود کترتے ہوئے لاڈو بکری کے پاس گیا جو اپنے میمنوں کی کمر کھاتے ہوئے انہیں بادام پری کی کہانی سنارہی تھی۔

گوگا بندر کی شرارتوں سے ناصرف اس کے والدین بلکہ جنگل کے سارے جانور نالاں تھے۔ کل ہی کی بات ہے کہ جب لنگور درخت پر گہری نیند سو رہا تھا اور اس کی لمبی دم ہوا میں گھڑی کے پنڈولم کی طرح ڈول رہی تھی تو گوگا بندر نے چپکے سے اس کی دم کی گانٹھ درخت کی شاخ سے باندھ دی اور نیچے جا کر سانپ سانپ کا شور مچا دیا۔ لنگور میاں جو ہڑ بڑا کر اٹھے تو شاخ پر چمگاڈ کی طرح لٹک گئے۔ کچھ ہی دنوں پیشتر جب بے چاری بھولی بھالی بی فاختہ دانہ دنکا چگنے باہر نکلیں تو گوگا بندر نے اس کے تینوں انڈے غائب کر دیے اور جب بی فاختہ کو بین کر کے روتے دیکھا تو گوگا بندر نے جھٹ قسم کھاتے ہوئے کہا:

”قسم ناریل کے درخت کی میں نے کالے کوئے کو تمہارے گھونسلے کے چکر لگاتے دیکھا تھا۔“ اور جب فاختہ اور کوئے کی تکرار ہوئی تو وہ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر مزے سے تماشا دیکھنے لگا۔

ایک دن جب شہر سے کچھ لوگ پکنک منانے آئے اور آم کے درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا تو شریر گوگا بندر درخت پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ ایک شخص نے بیگ سے ایک بڑا سا آئینہ نکالا اور شیو



”ارے لاڈو بہن! تم یہاں لیٹی آرام کر رہی ہو اور وہاں تمہاری سہیلی آم کے درخت پر چڑھی کیریاں کھا رہی ہے۔“ گوگا بندر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”چل جھوٹے! بھلا بکری درخت پر کیسے چڑھ سکتی ہے۔“ لاڈو نے حیرت سے کہا۔

”ہاں جی، ہم تو ہیں ہی جھوٹے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، چلو میرے ساتھ اور خود دیکھ لو۔ اگر جھوٹ ہو تو میرا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دینا۔“

”ارے تیرا منہ تو ویسے ہی کالا ہے۔ اچھا چل دیکھتی ہوں۔“

جب لاڈو بکری نے درخت کے نیچے پہنچ کر اوپر دیکھا تو اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ واقعی درخت پر بکری تھی جس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

”ارے گوگا بندر! تو کہوے تو سچ ہے۔ میں ابھی جاتی ہوں اور اپنی سب سہیلیوں کو یہ عجیب واقعہ سناتی ہوں۔“ لاڈو نے بھاگتے ہوئے کہا۔

لاڈو کے جانے کے بعد گوگا بندر منہ پر ہاتھ رکھ کر خوب ہنسا اور گلابو گائے کے تھان پر پہنچا اور اس کی پٹکھا جھلتی دم پر پیار سے ہاتھ رکھ کر بولا:

”گلابو! تم یہاں کھڑی مزے سے جگالی کر رہی ہو اور وہاں تمہاری ایک سہیلی آم کے درخت پر چڑھی ہرے ہرے نرم پتے کھا رہی ہے۔“

”ارے جا لپاڑیے! تو تو ہے ہی سدا کا جھوٹا۔ بھلا گائے درخت پر کیسے چڑھ سکتی ہے۔“ گائے نے حیرت سے کہا۔

”ہاں جی، ہم تو ہیں ہی جھوٹے۔ چلو میرے ساتھ اگر جھوٹ ہو تو اپنے سینگوں سے میرا پیٹ پھاڑ دینا۔“

اور جب گائے نے درخت کے قریب جا کر اوپر دیکھا تو حیرت سے ڈکرائی۔

”ارے یہ موا گوگا بندر کہتا تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی اپنی سب

سہیلیوں کو یہ خبر دیتی ہوں۔“

گائے کے جاتے ہی گوگا بندر تالیاں بجا بجا کر خوب ہنسا اور پھر ہاتھی چٹان خاں کی طرف روانہ ہوا۔ ہاتھی دریا کے کنارے اپنی سوئڈ میں پانی بھر کر اپنے دونوں ننھے بچوں کو نہلا رہا تھا۔

”کیوں بھی گوگا بندر! کہاں آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے۔“ ہاتھی نے شرارتا پانی کی بوچھاڑ گوگا بندر کے اوپر پھینکتے ہوئے کہا۔

”چٹان چچا! آپ کو کچھ پتا بھی ہے۔ آپ کا دوست پہاڑ خاں درخت پر چڑھا آم کھا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کے وزن سے آم کا درخت ڈھے نہ جائے۔ سارے پرندوں کے گھونسلے بھی اجڑ جائیں گے۔“

”اچھا! تو اب تو مجھ سے بھی مذاق کرنے لگا۔ چل میرے ساتھ اگر جھوٹ نکلا تو وہیں پیر سے مسل دوں گا۔“ ہاتھی چٹکھاڑا۔

ہاتھی نے جب درخت کے اوپر نظر ڈالی تو اس کی سوئڈ بھی حیرت سے سوالیہ نشان کی شکل میں اٹھی کی اٹھی رہ گئی۔ ہاتھی بھی دوڑتا ہوا یہ سنسنی خیز خبر اپنے ساتھیوں کو سنانے جنگل کی طرف بھاگا۔

ادھر لاڈو بکری اور گلابو گائے دھان کے کھیت میں ہونقوں کی طرح بھاگی جا رہی تھیں۔ بکری نے ہانپتے ہوئے گائے سے کہا:

”اری گلابو! آج تو میں نے عجیب منظر دیکھا۔ تم یقین نہیں کرو گی.....“

گائے نے بکری کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”ارے چھوڑو، پہلے میری بات سنو۔“

”نہیں، پہلے میری سنو!“ بکری زور سے منمنائی۔ ”وہ ٹیوب ویل کے پاس آم کے درخت پر ایک بکری منہ کھولے بیٹھی ہوئی ہے۔“ بکری نے ٹھہر کر سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو لاڈو! ارے اس درخت پر تو میری شکل کی گائے چڑھی ہوئی ہے۔“ گائے نے چیخ کر کہا۔

اب دونوں رک کر ایک دوسرے کو غصے سے دیکھنے لگیں۔ بکری چیخی: ”ارے تو کیا میں اندھی ہوں۔ مجھے بکری اور گائے میں تمیز نہیں۔ کہاں بکری جیسا معصوم جانور اور کہاں مرکھنی گائے۔“ ”دیکھ لاڈو! زبان سنبھال کر بات کر۔ زیادہ منمنائی تو سینگوں سے پیٹ پھاڑ دوں گی۔“

گوگا بندر مکروندوں کی جھاڑی میں چھپا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹہلتا ہوا آیا اور بکری اور گائے سے مخاطب ہوا:

”اچھا بھئی، دیکھو! یوں جاہل انسانوں کی طرح مت لڑو۔ چلو چچا ہاتھی سے فیصلہ کراؤ۔“

تینوں ہاتھی چٹان خاں کے پاس گئے جو اس وقت اپنے ساتھیوں کو ہاتھی کے پیڑ پر چڑھنے کی خبر سنا رہا تھا۔ لاڈو بکری نے

ہاتھی سے کہا:

”ہاتھی چچا! آپ کو معلوم ہے کہ مجھ جیسا سیدھا سادا جانور جنگل میں کوئی نہیں۔ میں نے ابھی آم کے درخت پر ایک بکری چڑھی دیکھی ہے اور یہ جھوٹی گلابو کہہ رہی ہے کہ درخت پر بکری نہیں، گائے ہے۔“

گائے نے آگے بڑھ کر کہا: ”چچا! میں اپنے اکلوتے بچھڑے کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ لاڈو جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے درخت پر گائے کو چڑھا دیکھا ہے۔“

”خاموش، اب اگر تم دونوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو پیر سے مسل کر رکھ دوں گا۔ تم دونوں کی شاید بینائی ختم ہو گئی ہے جو تمہیں درخت پر پہاڑ جیسے ہاتھی کی جگہ بکری اور گائے نظر آ رہے ہیں۔ بھاگو یہاں سے اگر خیریت چاہتی ہو۔“

گوگا بندر وہاں سے بھاگ کر مٹر کے کھیت میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں اس کی شرارت کا پول نہ کھل جائے۔ اس لیے اس نے چپکے سے وہ آئینہ اتار کر دریا میں بہا دیا۔ اس واقعہ کو ایک عرصہ بیت گیا ہے لیکن بکری، گائے اور ہاتھی اب بھی جب آم کے اس درخت کے نیچے سے گزرتے ہیں تو ایک بار نظریں اوپر اٹھا کر ضرور دیکھتے ہیں اور حیرت سے گردن ہلاتے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

☆☆☆

سلسلہ ”کھوج لگائیے“ میں ان بچوں کے جوابات بھی درست تھے

محمد احمد رضا قادری، کوٹ ادو۔ عنبر سیف، اسلام آباد۔ حافظ محمد عاقب، گجرات۔ محمد ابوبکر صدیق، لاہور۔ وسیم اکرم، گجرات۔ امامہ یاسر، لاہور۔ ابرار الحق عبد المجید، قصور۔ فضہ حسین، ڈیرہ اسماعیل خان۔ فہیمہ اشرف، مرید کے۔ صبا طاہر، اسلام آباد۔ عبد اللہ مقبول، ظفر وال۔ عبد المعین، کبیر والا، حفصہ فیروز، لاہور۔ ماریہ وسیم، محمد نجیب جیلانی، کراچی۔ رمشاء بنت ثناء، کراچی۔ انعام اللہ کاشر، جام پور۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ محمد سلمان فاروق، فیصل آباد۔ عائشہ عرتج، ڈیرہ غازی خان۔ آمنہ فاروق، چکوال۔ مآب زینت، جہلم کینٹ۔ شاہ زیب اظہر، اسلام آباد۔ عائشہ کریم، ملتان۔ حاجرہ، ایبٹ آباد۔ بسمہ افتخار، لاہور۔ سرہ حفیظ، راول پنڈی۔ عدینہ مقدس، فیصل آباد۔ حفصہ آصف، لاہور۔ ایمن امجد، راول پنڈی۔ غیور محسن عباس ہاشمی، فیصل آباد۔ ایمان نواب، راول پنڈی۔ امیر حمزہ شفیق، دریا خان۔ عبد اللہ بن ثقلین، بہاولپور۔ محمد رمیز بٹ، شاہ زیب، ردا فاطمہ، لاہور۔ محمد حامد رضا قادری، کاموکی۔ سعد بٹ، صخی بدر، شبیل حیدر، لاہور۔ محمد احمد، شیخوپورہ۔ عائشہ وحید، بہاولپور۔ صفا شاہد، خانیوال۔ عائزہ ضیاء، نور فاطمہ، سرگودھا۔ حمزہ وسیم، میرپور آزاد کشمیر۔ اریب احمد، واہ کینٹ۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ۔ مہتاب احمد، کرک۔ عدن شاہد، گوجرانوالہ۔ سعد علی، سرگودھا۔ محمد فریاد علی قادری، کاموکی۔ حسنین احمد مغل، میرپور آزاد کشمیر۔ محمد شہزاد، نوشہرہ۔ صبا خان، واہ کینٹ۔ فواد اعظم، ملتان۔ سید اشہد بخاری، دریا خان۔

موسم بہار

ہر شجر پہ یہاں برگ و بار آ گیا
 بے حساب آ گیا بے شمار آ گیا
 مرغ زاروں میں کلیاں چٹکنے لگیں
 رنگ شاخ چمن پہ نکھار آ گیا
 پھر سے باغوں میں بلبل چٹکنے لگی
 پھر نشہ چھا گیا اک خمار آ گیا
 جس طرف دیکھیے پھول ہی پھول ہیں
 اور پھولوں پہ اس دل کو پیار آ گیا
 خوشبوؤں سے معطر ہوئی سرزمین
 دیکھو دیکھو وہ موسم بہار آ گیا
 خوش رہو ساتھ ساتھ مسکراؤ ہنسو
 لب پہ حرفِ دعا بار بار آ گیا

کرامت بخاری





شاہد اور اس کے دوست

اور دو بچے ان کے گھر ایک ڈاکے نے آواز دی۔ ستار صاحب کے گھر کا نچلا حصہ بالکل مقفل تھا۔ اوپر والے پورشن پر ستار صاحب اپنی بیوی اور شاہد کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔

سیڑھیاں گھر کے باہر گلی میں اترتی تھیں اور جب تک کوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر لوہے کا گیٹ نہ کھولے، کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ ستار صاحب نے چھت سے جھانکا تو سخت گرمی کی وجہ سے گلی ویران پڑی تھی۔ دونو جوان لڑکے نیچے کھڑے تھے۔ ایک نے ستار صاحب کو کوٹھے سے جھانکتے دیکھا تو کہا کہ شاہد کا پارسل آیا ہے۔ ستار صاحب نے شاہد کو کہا کہ وہ نیچے جا کر پارسل وصول کر لے۔ شاہد نیچے تو اکیلا گیا مگر واپسی پر دونوں لڑکے شاہد کے ساتھ تھے جنہوں نے اس پر پستول تانے ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی سب کو ہینڈز اپ کرا لیا مگر وہاں کس نے مزاحمت کرنی تھی۔ انہوں نے تالے توڑنے کا کام ہی اس الماری سے شروع کیا جہاں رقم رکھی ہوئی تھی۔ بیس لاکھ روپے کی خطیر رقم تھی۔ انہیں شاید مزید تلاشی لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ستار صاحب کو انہوں نے ان کی بیگم سمیت ایک کمرے میں بند کر دیا اور شاہد کو باندھ کر چلے گئے۔ باہر لوہے کا گیٹ کھلا دیکھ کر کسی واقف کار نے

ستار صاحب ساری زندگی لندن میں رہے، مگر پاکستان کو یاد کرتے رہے۔ اب ماشاء اللہ ان کی عمر پینسٹھ سال ہوگی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا، مگر ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ایک بیٹی تھی جو شادی کے بعد پاکستان میں ہی رہتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اب ستار صاحب کا اکلوتا رشتہ دار ایک نواسا تھا جس کا نام شاہد تھا۔ ستار صاحب کے داماد نے دوسری شادی کر لی تو ستار صاحب چاہتے تھے کہ شاہد لندن انہی کے پاس چلا آئے تاکہ ان کی تنہائی بھی دور ہو جائے مگر شاہد بچپن سے ہی بگڑا ہوا بچہ تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اور بگڑ گیا حتیٰ کہ اب اس پر چوری کے ایک دو مقدمات بھی درج ہو چکے تھے۔ مجرمانہ ریکارڈ ہونے کی وجہ سے شاہد لندن نہ جاسکا تو ستار صاحب اپنی بوڑھی بیوی کے ساتھ پاکستان آ گئے تاکہ بقیہ زندگی اپنے نواسے کے ساتھ پاکستان میں گزاریں۔ دو چار دن شاہد ان کے سامنے شریف بنا رہا لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔ ستار صاحب نے ایک سودے کے لیے کثیر رقم بینک سے نکلوائی کیوں کہ اگلے دن وہ رقم کسی کو ادا کی جانی تھی۔ شاہد اپنے نانا کے ساتھ بینک گیا تو راستے میں ہی اس نے واردات کرنے کا تانا بانا بن لیا تھا۔ دوپہر بارہ بجے وہ بینک سے لوٹے

آ کر شاہد کو کھولا اور ستار صاحب کو کمرے سے نکالا۔ یہ واردات میرے تھانہ کی حدود میں ہوئی۔ اطلاع ملنے پر میں عملے کے ساتھ ستار صاحب کے گھر پہنچا۔ ان کی ساری کہانی سنی تو کہانی میں شاہد پر شک کرنے کے کئی پہلو تھے۔ شاہد کا پارسل اس وقت آنا جب دوپہر کو گلی میں کوئی نہ ہو۔ ستار صاحب کے علاوہ صرف شاہد کو رقم کے بارے میں علم تھا۔ شاہد کا مجرمانہ ریکارڈ۔ ڈاکوؤں کا صرف اس الماری کی تلاشی لینا جہاں رقم موجود تھی۔

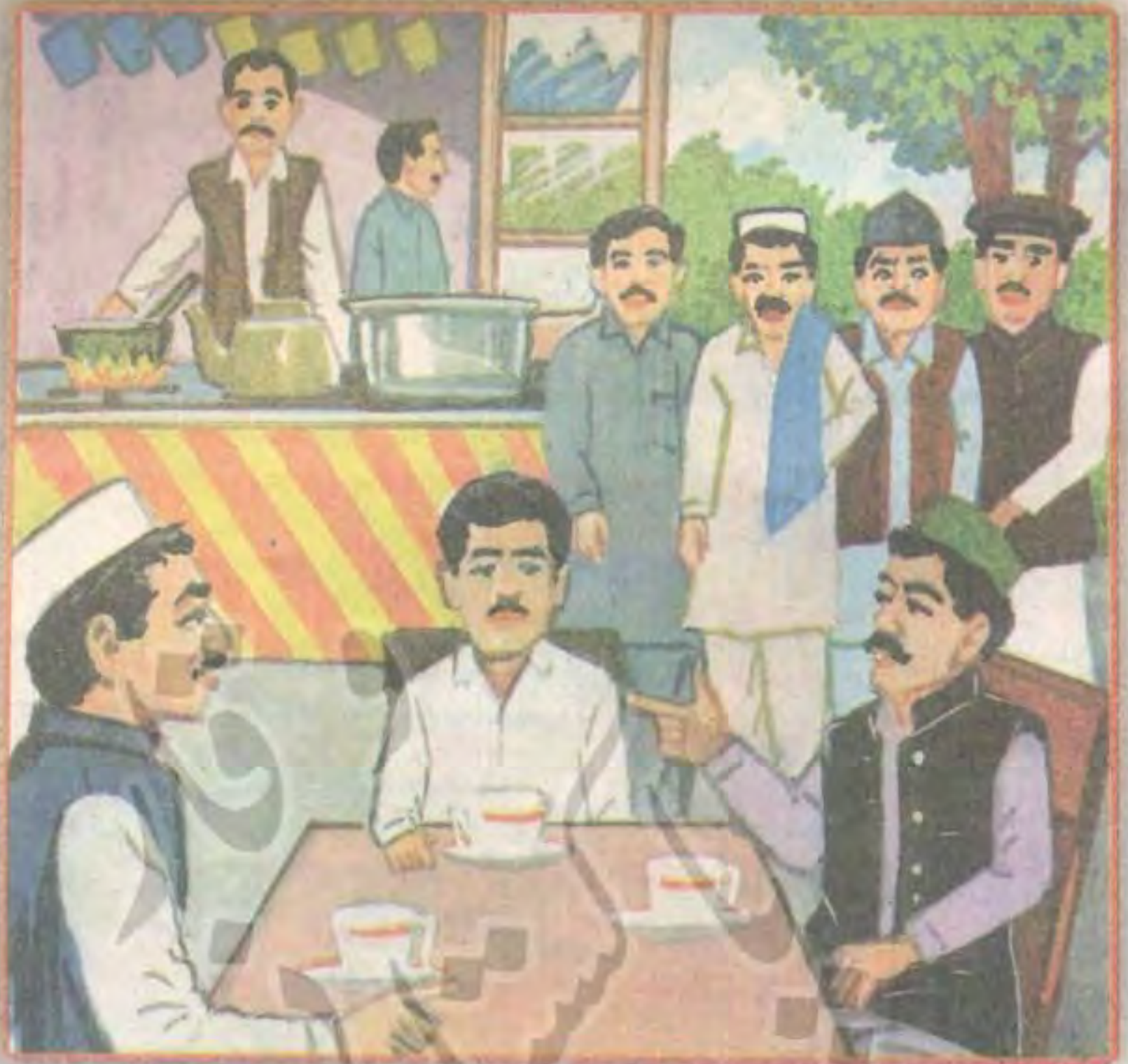
شام کو ستار صاحب مقدمہ درج کروانے تھانہ آئے اور میری ان سے علیحدہ ملاقات ہوئی۔ شاہد ان کے ساتھ تھا مگر جب میں نے ستار صاحب کو علیحدہ ملنا چاہا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اپنے خدشات کا اظہار ستار صاحب سے کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا کندھا دبا کر کہنے لگے کہ شاہد کو ضرورت تو نہ تھی سب کچھ اسی کا تو تھا۔ انہوں نے مقدمہ درج کروانے سے بھی انکار کر دیا۔ دو دن کے بعد وہ اپنی بیوی اور شاہد کی نانی کے ہمراہ واپس لندن لوٹ گئے لیکن میرے ذہن میں شاہد کی چمکتی ہوئی شاطر آنکھیں پیوست ہو گئیں۔

کچھ دنوں کے بعد شہر کے وسط میں واقع ایک جنرل اسٹور میں ڈکیتی ہوئی۔ پانچ ڈاکو نہ صرف جنرل اسٹور کی سارے دن کی بکری لوٹ کر لے گئے بلکہ وہاں شاپنگ کے لیے آئے ہوئے لوگوں سے بھی لوٹ مار کی۔ ڈاکو نقاب پوش تھے اور دس منٹ میں واردات مکمل کر کے چلتے بنے۔ جس گاڑی پر وہ آئے وہ بعد میں چیک کروائی گئی تو اس پر نمبر پلیٹ جعلی لگی ہوئی تھی۔ صرف لٹنے والوں نے بتایا کہ وہ چال ڈھال سے اور بولنے کے انداز سے پٹھان لگتے تھے۔ ہم نے اس تفتیش میں جس انداز سے بھی کوئی سراغ لگانے کی کوشش کی، ناکام رہے۔ سینئر افسران بھی ناراض تھے کیونکہ شہر میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

میرے ذہن میں ابھی بھی شاہد کی یاد تازہ تھی۔ میں نے ازراہ تجسس اس کا پتا کیا کہ نانا کے لندن جانے کے بعد اس کا کیا بنا؟ تو معلوم ہوا کہ کئی دنوں سے کسی کو نظر نہیں آیا مگر اس سے اہم اطلاع یہ تھی کہ اس وقت وہ لٹنے والے اسٹور کے پچھلے محلہ میں کرائے پر مکان لے کر رہ رہا تھا۔ محلے والوں کی رپورٹ یہ تھی کہ جہاں وہ

رات گزارنے کبھی کبھار محلہ میں آتا تو اس کے ساتھ آنے والے لوگ دُور سے بدقماش دکھائی دیتے۔ میں نے کچھ اپنے لوگوں کو اس کی ٹوہ لگانے پر لگا دیا مگر کچھ عرصہ کے بعد جب کہ ابھی ہمیں پچھلی واردات کا ہی کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور نہ ہی کوئی شاہد کے بارے میں کوئی معلومات ملی تھیں کہ شہر کی غلہ منڈی میں ایک کیڑے مارنے والی دواؤں کے مرکز کو لوٹ لیا گیا۔ اب آپ ذرا اندازہ کیجیے کہ ڈاکوؤں کی تعداد کتنی تھی؟ ہاں! آپ بالکل صحیح سمجھے وہ پانچ نقاب پوش ڈاکو ہی تھے۔ آپ ایک اور اندازہ لگائیں کہ ان کے حلیے کیسے تھے؟ جی ہاں! آپ بالکل صحیح سمجھے ہیں ان کے حلیے بالکل سرگودھا میانوالی کے پٹھانوں جیسے تھے۔ مالک نے ذرا سی مزاحمت کی کوشش کی تو انہوں نے بے دریغ پستل سے فار کر کے اس کا بایاں ہاتھ زخمی کر دیا۔ شکر ہے کہ نشانہ چوکنے سے اس کی جان بچ گئی، ورنہ ڈاکو نے تو سیدھا اس کی طرف فار کیا تھا۔

بیچ پوچھے تو کسی اور سراغ ڈھونڈنے کے لیے تو میں نے محنت کی ہو یا نہ ہو مگر یہ کوشش ضرور کی کہ کیا شاہد کا اس ڈکیتی میں کسی قسم کا رول ہو سکتا ہے یا نہیں اور یہ جلد ہی ثابت ہو گیا۔ جب میرے ”خاص“ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس لٹے ہوئے سپرے سنٹر کے عقب میں کبھی شاہد کے والد کا بھی سپرے سنٹر چلتا تھا۔ کئی دنوں سے وہ دکان بند پڑی تھی لیکن پتا چلا کہ دو روز قبل شاہد دکان کھول کر بیٹھا رہا۔ ظاہر ہے وہ کاروبار کرنے تو نہیں آیا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے دکان پر رہا اور ارد گرد کے لوگوں سے خیر خیریت پوچھتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ صرف ڈکیتی کے لیے دکان والوں کی نقل و حرکت نوٹ کرتا رہا تھا۔ اب میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے بھرپور کوشش سے آخر شاہد کو گرفتار کر لیا۔ شاہد کی عمر تقریباً بیس سال ہو گی اور وہ ایک کڑیل جوان تھا۔ بڑی اہم پیشرفت تھی۔ شاہد کو تین چار دن مختلف حربے استعمال کر کے ہم نے سچ بولنے پر مجبور کر لیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے چند پٹھان دوست ہیں جو میانوالی میں رہتے ہیں۔ عام طور پر اسلحہ کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس نے دونوں وارداتیں ان کے ساتھ مل کر کی ہیں۔ میں نے اسے ستار صاحب والی واردات کا یاد دلایا تو بے نیازی سے کہنے لگا کہ وہ تو آپ پہلے دن سے ہی جانتے ہیں، کیا بتاؤں؟ میں نے اس



اگلے دن شاہد کے پٹھان دوستوں کی گاڑی ریلوے اسٹیشن کی حدود میں واقع چائے کے ایک ہوٹل پر رُکی۔ شاہد چائے کے ہوٹل میں میرے پٹھان سپاہیوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ دونوں سپاہیوں کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور پٹھانوں کی گکڑیاں پہنے شلوار قمیص میں ملبوس دونوں بڑے بچ رہے تھے۔ آنے والے چاروں پٹھان بلا جھجک شاہد کی طرف بڑھے اور پٹھان سپاہیوں کے ساتھ گلے مل کر ان کی میز پر ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ شاہد نے بیرے کو چائے لانے کا اشارہ کیا۔ ہوٹل کے سامنے ریلوے اسٹیشن کی کار پارکنگ تھی جس میں ہماری کاریں موجود تھیں اور میں

سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں کو پکڑوا دے گا تو اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی۔ اس نے اپنے دوستوں کے نام بتا دیے۔ یہ نام شاہد کے موبائل میں بھی ریکارڈ تھے۔

میں نے تھانہ میں تعینات دو پٹھان کانستبلان کو اعتماد میں لیا۔ شاہد جس کا موبائل نمبر ہم نے کئی دن سے بند رکھا ہوا تھا، اسے آن کیا۔ میں نے شاہد کی بات اس کے پٹھان دوستوں سے کروائی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھے کہ شاہد کا فون اتنے دنوں سے بند کیوں تھا؟ اور واردات میں لوٹی ہوئی رقم میں سے بھی شاہد نے حصہ لینے کے لیے ان سے رابطہ نہیں کیا۔ شاہد نے انہیں بتایا کہ اس کے کسی رشتہ دار سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا تو اس رشتہ دار نے شاہد کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا جس پر اس کا فون بند رہا۔ یہ بہانہ کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اگر پٹھانوں کو علم ہو بھی گیا کہ شاہد پولیس کے قبضے میں رہا ہے تو وہ یہی سمجھیں کہ پولیس کو دوسری وارداتوں کا علم نہیں ہوا۔

شاہد نے ان کو دو کام کرنے کے لیے بلایا۔ ایک تو اس فرضی رشتہ دار سے بدلہ لینے کے لیے اور دوسرا میرے پٹھان کانستبلان سے اسلحہ کے سودے کے لیے۔ ظاہر ہے کہ یہ سودا بھی فرضی تھا۔

اپنے عملہ کے ساتھ ان میں موجود تھا اور ہم پٹھانوں کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔ مہمان پٹھانوں کی بھی اور میزبان پٹھانوں کی بھی۔ پٹھانوں کے گاڑی سے اترتے ہی سادہ کپڑوں میں ملبوس سپاہیوں نے ان کی گاڑی کو گھیرے میں لے لیا تھا، مگر پٹھانوں کو شک نہ ہوا۔ ہم سادہ کپڑے پہنے ہوٹل کے اندر ان کے نزدیک بھی چلے گئے انہیں پھر بھی شک نہ ہوا۔ اب ان کو پکڑنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ہمیں ملزم بھی مل گئے، وارداتیں بھی ٹریس ہو گئیں۔ پٹھان جو اسلحہ بیچنے گاڑی بھر کر لائے تھے، وہ بھی مل گئی۔ شہر میں ہونے والی کئی وارداتوں اور اپنے علاقہ میں ان پر ہاتھ ڈالنا بلکہ انہیں ڈھونڈنا بھی مشکل ہوتا مگر بھلا ہو شاہد کا جس نے بڑی مچھلیوں کو مجبور کیا کہ وہ چل کر آئیں اور ہمارے جال میں پھنس جائیں۔

رہا سوال شاہد کے ساتھ کیے گئے وعدے کی پاسداری کا، تو رہنے دیجیے پولیس والوں کو مجرموں سے راز اگلوانے کے لیے اتنا جھوٹ تو معاف ہوتا ہے لیکن اکثر مجھے شاہد کا سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ اتنی کم عمری میں وہ مجرم بن گیا۔ اگر اس کے والدین اس کی تربیت پر توجہ دیتے اور اس کے دوستوں کی صحبت پر نظر رکھتے تو وہ ایک اچھا انسان ہوتا، مجرم نہ بنتا۔

بلا عنوان



اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اپریل 2013ء ہے۔



مارچ 2013ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

▶ پن گئی گھس، غبارہ ہو گیا پھس۔ (تابندہ آفتاب، کراچی)

▶ چاچا بھرے غبارہ، منا کرے ناکارہ۔ (جویریہ رحمن رانا، کلور کوٹ)

▶ تمام غبارے بچوں کی پہنچ سے دُور رکھیں۔ (بلال احمد، انک)

▶ باپ بنائے، بیٹا ڈھائے۔ (نمرہ بشیر، ساہی وال)

▶ انکل کی فنکاری، بچے کی تخریب کاری۔ (حسن علی عتیق، لاہور)



وادی کشمیر

ہونہار مصور

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔



حافظ محمد علی رضا، فیصل آباد (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)



لائبہ شاہد، گوجرانوالہ (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)



رومیشہ مختار، فیصل آباد (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)



عروج عمر، نارنگ منڈی (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



ثناء رحمن، واہ کینٹ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)



راوا ہاذکی، لاہور (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام یہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد سعد ذکی، لاہور۔ شمرہ شہزاد، لاہور۔ فیصیحہ مقبول، نارووال۔ عبدالرحمن، لاہور۔ محمد حمزہ مقصود، ملتان۔ محمد ابوہریرہ، علی پور چٹھہ۔ محمد صہیب مبشر، صداقت علی، لاہور۔ محمد وقار وکیل، بھکر۔ مہدی علی عتیق، لاہور۔ امین، ملتان۔ زین العابدین شاہ، رحیم یار خان۔ امیر حمزہ شفیق، بھکر۔ مصباح نذیر، ہاجرہ کفیل، میوند لاریب، مشعل کامران، واہ کینٹ۔ صوبیہ انجم، میر پور۔ عائشہ ادریسی، عبدالمومن ادریسی، علی پور۔ سیف اللہ آفریدی، راول پنڈی۔ زینب احسن، پشاور۔ احمد رضا انصاری، کوٹ ادو۔ آمنہ شکور، لاہور۔ نزل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ کنزا نوید الرحمن، لاہور۔ سائرہ فاطمہ، میانوالی۔ عید سعید، اسامہ چوہدری، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عبداللہ ملک، فائقہ نوید ملک، لاہور۔ محمد ایان بخاری، دریا خان۔ امامہ الطاف، میانوالی۔ وردہ یسین، لاہور۔ شبیل سہیل، اسلام آباد۔ صبا عارف، لاہور۔ سائرہ بتول، لاہور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹر/میس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جون کا موضوع
شاہ فیصل مسجد

مئی کا موضوع
پہاڑ اور گہری

آخری تاریخ 8 مئی

آخری تاریخ 8 اپریل